

ایک خوفناک ناول

ڈریکولا کی واپسی

PDFBOOKSFREE.PK

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

جان برکے

ایک بچہ کی یادداشت (ڈریگولا کا خاتمہ)

مینا ہار کر کارو زنا چ

۶ نومبر۔ دوپہر ڈھل رہی تھی کہ ہم مشرق کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی طرف سے میرا جنا تھن آرہا ہے۔ یوں میرا دل کستا تھا۔ ہماری رفتار تیز نہ تھی۔ حالانکہ ہم ڈھلان اتر رہے تھے۔ ہم مال و سامان سے لدے ہوئے تھے۔ کمبلوں اور اشیائے خورد و نوش کا کافی ذخیرہ ہمارے پاس تھا۔ ہم یہ سامان پھینک دیتے لیکن یہ خطہ جہاں ہم سفر کر رہے تھے۔ بالکل غیر آباد تھا۔ کوئی ایک میل چلنے کے بعد میں تھک کر بیٹھ گئی۔ ہم نے پیچھے دیکھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر نیلے آسمان کے پس منظر قعر ڈریگولا اپنی تمام تربیت ناکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور اس کے پیچھے ننگے ننگے پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ اور سامنے برف سے ڈھکا ہوا راستہ تھا جو بلندیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ ہر طرف وحشت برس رہی تھی اور کہیں دور سے بھیڑیوں کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ پروفیسر صاحب کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں ہم تھوڑی دیر کے لئے سستالیں اور بھیڑیوں سے محفوظ رہیں۔

سواروں کا ایک گروہ بھاگ چلا آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے حلقے میں ایک چھکڑا تھا۔ جو کچی سڑک پر بری طرح اچھل اور ڈول رہا تھا۔ ان لوگوں کو پہچاننے میں مجھے دیر نہ لگی۔ ان کا لباس اور وضع قطع بتا رہی تھی کہ وہ خانہ بدوش ہیں۔

چھکڑے میں ایک بڑا سا چوکور تابوت رکھا ہوا تھا جسے دیکھتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ انجام قریب تھا۔ شام ہو چلی تھی۔ اور میں جانتی تھی کہ سورج غروب ہوتے ہی ”وہ“ جس تابوت میں سویا ہوا ہے، تابوت سے نکل کر اور روپ بدل کر فرار ہو سکے گا۔ اس خیال نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ میں پروفیسر صاحب کی طرف پلٹی لیکن وہ وہاں نہ تھے۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ پروفیسر صاحب چٹان کے قدموں میں لکڑی کی نوک سے دائرہ کھینچنے میں مصروف تھے۔ جیسا کہ ہگزشتہ رات کھینچا تھا۔ دائرے کے محیط پر مقدس روٹی کے ٹکڑے بکھیر کر وہ میرے پاس آئے اور بولے۔

”اس دائرے میں تم کم سے کم اس عفریت سے تو محفوظ ہو۔“

انہوں نے میرے ہاتھ سے دور بین لے کر اپنی آنکھوں سے لگالی۔ چند ثانیوں کے لئے برف گرنا بند ہو گئی۔ پروفیسر صاحب نے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بہت غلت میں ہیں۔ گھوڑوں پر بے تحاشہ چابک برسا رہے ہیں۔“

اور پھر چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

”وہ لوگ سورج غروب ہونے سے پہلے منزل تک پہنچ جانا چاہتے ہیں، مینا! ہم

شاید جیتی ہوئی بازی ہارنے والے ہیں۔ خیر! جو خدا کی مرضی۔“

برف گرنے لگی اور ہم کچھ دیکھ نہ سکے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی برف گرنا پھر بند

ہو گئی۔ پروفیسر صاحب نے دور بین آنکھوں سے لگالی اور چند لمحوں بعد خوشی سے چیخ

تھوڑی دیر بعد پروفیسر صاحب نے اشارے سے مجھے بلایا۔ میں اٹھ کر ان کے پاس پہنچی۔ انہوں نے بے حد اچھی جگہ تلاش کر لی تھی۔ چٹانی سلسلے میں ایک شکاف تھا جس میں داخل ہونے کا دروازہ نیچا اور مخرابی تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اس شکاف میں لے گئے۔

”مینا! یہاں تم سردی اور برف سے محفوظ رہو گی۔“ انہوں نے کہا۔ ”اگر بھیڑیے آگئے تو ہم پر چاروں طرف سے حملہ نہ کر سکیں گے۔ اور میں شکاف کے دہانے پر کھڑا ہو کر آسانی سے ان کا مقابلہ کر سکوں گا۔“

وہ باہر جا کر کمبل اور دوسری چیزیں اٹھا لائے۔ میرے لئے بستریاں کیا اور کھانا نکال کر مجھے مجبور کیا کہ میں تھوڑا سا کھالوں۔ لیکن میں نہ کھاسکی۔ خدا جانے کیوں کھانا دیکھتے ہی میرا جی متلانے لگا۔ کوشش کے باوجود میں ایک لقمہ بھی نہ کھاسکی۔ پروفیسر صاحب اداس ہو گئے لیکن منہ سے کچھ نہ کہا اور نہ ہی مجھے پھر مجبور کیا۔

اپنی دور بین لے کر وہ قریب کی چٹان پر چڑھ گئے اور اسے آنکھوں سے لگا کے افق کا جائزہ لینے لگے۔

”مینا! مینا! دیکھو۔“

میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچی۔ انہوں نے دور بین مجھے دے کر ایک طرف اشارہ کیا۔ اب برف باری کچھ زیادہ ہی ہو رہی تھی۔ اور ہوا میں بھی تیزی آگئی تھی۔ کبھی کبھی ہوا برف کو اڑا لے جاتی یا پھر تھوڑی دیر کے لئے برف گرنا بند ہو جاتی تو میں دور دور تک دور بین کی مدد سے دیکھ سکتی تھی۔

ہمارے قدموں میں برف سے ڈھکا ہوا میدان حد نظر تک پھیلا ہوا تھا اور دور بہت دور ایک سیاہ لکیر اس میدان میں سے گزر رہی تھی جو غالباً دریا تھا۔ اور ہمارے سامنے اور اتنے قریب کہ مجھے حیرت ہوئی کہ ہماری نظران پر کیوں نہ پڑی۔ گھر

کر بولے۔

”مینا! دیکھو! دیکھو! دو گھڑ سوار حیرت انگیز تیز رفتاری سے چھڑے کی طرف آرہے ہیں۔ دونوں شمال کی طرف سے آرہے ہیں اس لئے یقیناً ہمارے دوست کوئی اور جان ہیں۔ لویہ دور بین اور اس سے پہلے کہ برف دوبارہ گرنے لگے انہیں پہچاننے کی کوشش کرو۔“

میں نے دور بین لگا کے شمال کی طرف دیکھا وہ دونوں ڈاکٹر سینورڈ اور کوئی ہی تھے کیونکہ ان میں سے ایک بھی جنا تھن کا سنا تھا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ جنا تھن بھی زیادہ دور نہیں۔ میں نے جنوب کی طرف دیکھا اور میرے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ دوسرے دو گھڑ سوار خطرناک تیز رفتاری سے بھاگے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک، میں نے پہچان لیا، جنا تھن تھا چنانچہ دوسرا آرتھر تھا۔ وہ دونوں بھی چھڑے کی طرف ہی آرہے تھے۔ میں نے پروفیسر صاحب کو ان دونوں کی آمد کی اطلاع دی تو وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ انہوں نے مجھ سے دور بین لے لی اور ان کی طرف دیکھنے لگے۔ یہاں تک کہ برف کا ایک ریلا گرا اور ہماری نظروں کے سامنے سفید چادر سی تن گئی۔ پروفیسر صاحب چٹان کے شکاف میں گھس کر دو چمشر بندوق لے آئے اور ایک پتھر کے سارے کھڑی کر کے بولے۔

”وہ لوگ بڑی تیزی سے آرہے ہیں چنانچہ ہم جلد ہی ان خانہ بدوشوں کے نرسے میں ہوں گے۔ اسی خیال سے میں بندوق نکال لایا ہوں۔“

میں نے بھی اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ بھیڑیوں کے چلانے کی آوازیں قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ چنانچہ چند ثانیوں کے لئے برف گرنی بند ہوئی تو ہم نے پھر آنے والوں کی طرف دیکھا۔ عجیب بات تھی کہ برف ہمارے چاروں طرف گر رہی تھی لیکن افق مغرب میں سورج چمک رہا تھا۔ وہ بلند پہاڑیوں کے پیچھے

چھپنے کے لئے تیزی سے ڈھل رہا تھا۔ میں نے چاروں سمتوں کا جائزہ لیا اور ہر چار طرف سے بڑے بڑے بھیاںک سائے ہماری طرف بڑھتے نظر آئے۔ یہ بھیڑیے تھے۔

ہم بے چینی سے منتظر تھے کہ کیا ہوتا ہے۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک سال ہو رہا تھا۔ یکایک ہوا تیز ہو گئی اور برف کے گالے رقص سا کرنے لگے اور چند ثانیوں بعد ہی فضا صاف تھی۔ اور اب ہم دور تک دیکھ سکتے تھے۔ پچھلے چند مہینوں سے ہم سورج کے طلوع و غروب کی طرف اتنے متوجہ ہو رہے تھے کہ اب ہم جانتے تھے کہ وہ کب طلوع اور کب غروب ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اس طلوع و غروب کی علامتیں کیا ہیں۔ ہمیں چٹان پر کھڑے ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ آنے والے بہت قریب آگئے۔ ہوا بہت زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ جیسے ہمیں چٹان پر سے گرا دینا چاہتی ہو۔ کبھی کبھی برف کا ریلا آجاتا تھا ورنہ زیادہ تر فضا صاف ہی رہتی تھی۔ اب میں آنے والوں میں سے ہر ایک کو، یعنی جن کا تعاقب کیا جا رہا تھا اور جو تعاقب کر رہے تھے، بخوبی دیکھ اور پہچان سکتی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ لوگ جن کا تعاقب کیا جا رہا تھا، کرنے والوں کی طرف متوجہ نہ ہوئے یا تو خانہ بدوشوں نے انہیں دیکھا نہ تھا یا اگر دیکھا تھا تو ان سے ڈرتے نہ تھے۔ تاہم انہوں نے اپنی رفتار دگنی کر دی۔ سورج لمحہ بہ لمحہ ڈھلتا جا رہا تھا۔ خانہ بدوش بار بار سورج کی طرف دیکھتے اور گھوڑوں پر چابک برسانے لگتے چھکڑا زیادہ ڈولنے لگتا اور گھوڑے اپنی رفتار تیز کر دیتے۔

آنے والے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ میں اور پروفیسر صاحب پتھر کے پیچھے چھپ گئے۔ ہم دونوں بندوق اور پستول لئے تیار بیٹھے تھے۔ پروفیسر صاحب کے اوارے سے ظاہر تھا کہ وہ خانہ بدوشوں کو ہمیں روک لینے کا فیصلہ کئے ہوئے ہیں، خانہ بدوش اور ہمارے ساتھی بھی ہماری موجودگی سے بے خبر تھے۔

دھتتا" دو آدمیوں نے ایک زبان ہو کر اور چیخ کر کہا۔
"رک جاؤ۔"

ایک آواز جاتھن کی تھی اور دوسری ڈاکٹر سیورڈ کی تھی۔ خانہ بدوش یقیناً اس زبان سے، جس میں انہیں رک جانے کا حکم دیا گیا تھا واقف نہ تھے لیکن لب و لہجہ سے ہر آدمی، خواہ وہ کتنا ہی بے وقوف کیوں نہ ہو، اندازہ لگا سکتا تھا کہ اسے کیا حکم دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ خانہ بدوشوں نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں۔ بیک وقت ایک طرف سے کون سی اور ڈاکٹر سیورڈ اور دوسری طرف سے جاتھن اور آر تھر خانہ بدوشوں کے گروہ کی طرف بڑھے۔ خانہ بدوشوں کے سردار نے، جو ایک تو مند گھوڑے پر قسطنطین کی طرح سوار تھا اور نوجوان تھا خطرے کی بو پا کر اور چیخ کر کچھ کہا۔ یکایک خانہ بدوشوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی ہوا میں چابک بلند ہوئے۔ شراب کی آواز آئی اور گھوڑے بے تحاشہ بھاگ پڑے۔ چاروں تعاقب کنندگان نے بندوقوں کی ٹالیاں خانہ بدوشوں کی طرف کر دیں۔
"رک جاؤ" انہوں نے حکم دیا۔

عین اسی وقت میں اور دان پلسنگ بھی پتھر کے پیچھے سے نکل آئے ان کی بندوق اور میرے پستول کا رخ بھی خانہ بدوشوں کی طرف تھا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ گھر گئے خانہ بدوشوں نے گھوڑے روک لئے۔ سردار نے پھر کچھ کہا اور ہر آدمی نے وہ ہتھیار چاقو، چھری، نیزا، پستول جو جس کے پاس تھا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ فریقین مارنے مرنے پر تل گئے خانہ بدوش چھڑے کو اپنے حلقے میں لئے تیار کھڑے تھے۔

یکایک خانہ بدوشوں کا سردار اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کے آگے بڑھا اور پہلے غروب ہوتے ہوئے سورج اور پھر قصر ڈریکولا کی طرف اشارہ کر کے ہمارے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ جواب میں ہمارے ساتھی فوراً گھوڑوں پر سے اتر پڑے اور چھڑے کی طرف

بڑھے۔ کوئی اور وقت ہو تا تو میں خوف سے چیخ اٹھی ہوتی لیکن اس وقت ہم بھی اتنے ہی خطرے میں تھے جتنے کہ ہمارے ساتھی۔ اگر ان کے سروں پر موت منڈلا رہی تھی تو ہم بھی اس کے پروں کی پھڑ پھڑا ہٹ سن رہے تھے۔ چنانچہ دہشت زدہ ہونے کے بجائے میرا جی اپنے ساتھیوں کی مدد کرنے کو چاہا۔ ہمارے ساتھیوں کو یوں بڑھتے دیکھ کر نوجوان سردار نے پھر کچھ کہا اور خانہ بدوشوں نے چھڑے کے گرد اپنا حلقہ تنگ کر لیا۔

اور ہم نے دیکھا کہ ایک طرف سے جاتھن اور دوسری طرف سے کوئی خانہ بدوشوں کا حلقہ توڑتے ہوئے چھڑے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے اپنا کام پورا کر لینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت اب انہیں نہ روک سکتی تھی۔ کوئی چیز ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکتی تھی۔ حتیٰ کہ غروب ہوتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں چمکتے ہوئے خانہ بدوشوں کے جان لیوا چاقوؤں کی بھی انہوں نے پردانہ کی۔ اور نہ بھیڑیوں کی آواز ہی، جو دم بدم قریب ہوتی جا رہی تھی، انہیں اپنی طرف متوجہ کر سکی۔

جاتھن ایسے جوش سے بڑھا تھا کہ خانہ بدوش مرعوب ہو کے دائیں بائیں دب گئے اور اسے گزر جانے دیا۔ دوسرے ہی لمحے جاتھن کود کر چھڑے پر چڑھ گیا اور حیرت انگیز پھرتی سے تابوت اٹھا کے نیچے لٹھکا دیا۔ خدا جانے اتنی طاقت اس میں کہاں سے آگئی تھی۔ ادھر کوئی کو چھڑے تک پہنچنے میں قوت بازو سے کام لیتا پڑا۔ وہ خانہ بدوشوں کا حلقہ توڑتا اور انہیں دائیں بائیں دھکیلتا ہوا آگے بڑھا۔ بہت سے چاقوؤں کے پھل غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں چمک کر کوئی کی طرف بچھکے تھوڑی دیر تک ہمیں کوئی نظر نہ آیا اور پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا خانہ بدوشوں کے گروہ میں سے نکلا اور اب وہ جاتھن کے قریب کھڑا تھا۔

تابوت میں بچھی ہوئی مٹی میں مل گیا۔

میں عمر بھر اس خیال سے خوش ہوتی رہوں گی کہ اس وقت جب جناح کے چاقو اس کے حلق پر چل رہا تھا اور کوئی کا چاقو اس کے سینے میں اتر گیا تھا تو کوئٹہ کے بشرے سے تشکر، اطمینان اور سکون کے جذبات ہویدا تھے۔ جیسے وہ صدیوں کی غلامی کے بعد آج آزاد ہو رہا ہو۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور سرخ افق کے پس منظر میں پہاڑ کی چوٹی پر قدیم اور بوسیدہ دیواروں والا قصر ڈریکولا جیسے سو رہا تھا۔۔۔۔۔ پر ہیٹ اور عظیم۔۔۔۔۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اس عرصے میں جناح چھکڑے پر سے اتر آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کوئی اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھا اور اس کی انگلیوں کے بیچ میں سے جیتا جیتا خون ٹپک رہا تھا۔ وہ زخمی ہو گیا تھا۔ لیکن زخم کی پروا کئے بغیر وہ جناح کی مدد کرنے میں مصروف ہو گیا۔ جو اپنے بڑے چاقو سے تابوت کا ڈھکن کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی پائنتی کی طرف سے ڈھکن کھولنے لگا۔ دونوں نوجوانوں کی انتھک کوششوں کے بعد کیلیں اکھڑ گئیں اور انہوں نے ڈھکن اٹھا کے ایک طرف پھینک دیا۔

خانہ بدوش خاموش کھڑے دیکھتے رہے کیونکہ ڈاکٹر سیورڈ اور آر تھر کی بندوقوں کی ٹالیاں انہیں کی طرف تھیں۔ سورج پہاڑیوں کی چوٹی پر اٹک سا گیا تھا۔ وہ غروب ہونے کے قریب تھا۔۔۔۔۔ اور میں نے دیکھا کہ تابوت میں مٹی پر ڈریکولا دراز تھا۔ تھوڑی سی مٹی اس کے بدن پر بھی بکھر گئی تھی۔ کیونکہ جناح نے تابوت چھکڑے پر سے زمین پر لڑھکا دیا تھا۔ کوئٹہ ڈریکولا کا رنگ موم بنی کی طرح سفید تھا۔ اس کی آنکھیں خباثت سے چمک رہی تھیں اس کی آنکھوں کی اس چمک سے میں واقف تھی۔

کوئٹہ ڈریکولا نے نظریں گھما کے غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹ فتح مندانہ مسکراہٹ کی صورت میں اس کے نکیلے دانتوں پر کھینچ گئے۔ لیکن عین اسی وقت جناح کے چاقو کا لمبا پھل سورج کی شعاعوں میں چمکا اور دوسرے ہی لمحے وہ کوئٹہ کے حلق میں دستے تک اتر رہا تھا۔ جناح کا ہاتھ پھر بلند ہوا۔۔۔۔۔ اور اب وہ کوئٹہ کو ذبح کر رہا تھا۔ مارے دہشت کے میں چیخ پڑی۔۔۔۔۔ اسی وقت کوئی کا چاقو کوئٹہ کے سینے میں تیر گیا۔

یہ ایک خواب ہو سکتا ہے یا پھر معجزہ۔ لیکن وہ نہ خواب تھا اور نہ معجزہ تاہم ہم نے حیرت سے دیکھا کہ کوئٹہ ڈریکولا کا بدن ریزہ ریزہ ہونے لگا۔ اور پھر مٹی ہی کے

پہلا باب

کار ہتھما جانے والا راستہ شروع سے ہی خراب اور غیر ہموار تھا اور جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا بڑی باقاعدگی سے۔۔۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ بے قاعدگی سے اور بھی زیادہ خراب اور تکلیف دہ بنتا جا رہا تھا۔ اندھیرا اور اداس جنگل راستے کے دونوں کناروں کے زیادہ سے زیادہ قریب آتا جا رہا تھا جیسے اس باقی کچے راستے کو کچل کر اسے معدوم ہی کر دے گا۔ افق کے پس منظر میں دھرتی کی کوہان کی طرح ابھرے ہوئے کالے کالے مہیب سائے گرد سے اٹے ہوئے سنگلاخ خطے پر پڑ رہے تھے اور اس پورے اداس منظر کو ایسا ہمارے تھے کہ خواہ مخواہ دل پر بیت طاری ہونے لگتی تھی۔

کوچ گاڑی کے گھوڑے ٹھوکریں کھا رہے تھے اور گاڑی کے پیچھے غیر ہموار ہڑک پر پڑے ہوئے روڑوں اور پتھروں سے ٹکرا کر سامعہ میں بے ہنگم سی گرج پیدا کر رہے تھے، گاڑی بری طرح سے اچھل رہی تھی، اس کا ایک ایک حصہ جیسے احتجاجاً چرچا رہا تھا اور اس میں بیٹھے ہوئے چار مسافر پیندے میں سیسہ بھرے ڈبوں کی طرح دائیں بائیں ڈول رہے تھے اور ان کے سر آپس میں ٹکرانے سے بال بال بچ جاتے تھے۔

ارد گرد کا ویران وحشت انگیز منظر سفر کے ابتدائی حصے میں بڑا مسحور کن معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ اعصاب پر سوار ہونے لگا تھا۔ منظر کی اداسی اور ویرانی اور اس پر چھائی ہوئی مروہ سی خاموشی اب بیزار کرنے لگی تھی۔ پورے خطے پر دھند لگا چھا گیا تھا اور سامنے کا افق اندھیرا اور طوفانی ہو چلا تھا چاروں مسافر اب کسی ہوٹل کے گرم

ایک خوفناک ناول

اور اس واقعہ کے دس سال بعد ڈریکولا کی واپسی

اور روشن کمروں کی آرنو میں بے تاب و بے قرار ہونے لگے تھے۔ وہ اس خاموشی سے آلتا کے ہوٹل کی بھیڑ بھاڑ آوازوں اور قہقہوں اور کھانسی کو تلاش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جانتے تھے کہ گاڑی انہیں جس سرائے کی طرف لئے جارہی تھی اور جہاں انہیں قیام کرنا تھا وہ وی آتا کے اس ہوٹل کے درجہ کا تو یقیناً نہ ہوگا جہاں ان چاروں نے قیام کیا تھا اور جہاں سے وہ آرہے تھے۔

ان دور افتادہ اور تقریباً ویران علاقوں میں گھسنے کے بجائے اگر انہوں نے اپنی چھٹی کے بقیہ دن بھی چکیلے اور جگمگاتے ہوئے وی آتا گزار دئے ہوتے تو بہتر ہوتا لیکن چارلس ایک ہی منچلا اور ضدی تھا اور اس نے کہا تھا کہ اگر سیرو تفریح کو چلے ہیں تو ان کی تفریح صرف سیر اور مٹر گشتی تک محدود نہ رہنی چاہئے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس تفریح کو نہ صرف اور بھی زیادہ دلچسپ بلکہ یادگار بھی بنانا چاہئے اس نے کہا تھا کہ وہ چار ہیں اور چاروں ساتھ ہیں چنانچہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں چنانچہ کار ہتھما کی سنگلاخ بلندیوں کی چڑھائی بے حد دلچسپ سفید اور تقریباً سنسنی خیز ثابت ہوگی۔ اور چارلس کے تین ساتھیوں نے اس کی ضد اور جھٹ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

اور اب وہ اتنی دور آچکے تھے کہ واپس لوٹ جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا چنانچہ اب انہیں نقشے اور راہنما کتاب پر بھروسہ کرنا تھا حالانکہ راستہ جو نقشے میں ہموار اور دلچسپ معلوم ہوا تھا حقیقت میں دشوار گزار اور تکلیف دہ تھا لیکن اب ظاہر ہے کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ راستہ کتنا ہی دشوار گزار اور سفر کتنا ہی کٹھن کیوں نہ ہو انہیں بہر حال اپنا یہ سفر جاری رکھنا تھا۔ چنانچہ اب تو یہ چاروں مسافر صرف یہی چاہتے تھے کہ جلد از جلد سفر کا یہ دور ختم ہو جائے تاکہ وہ اپنے تھکے ہوئے جسم اور درد کرتی ہوئی ہڈیوں کو بستر پر ڈال سکیں۔ اس کبخت سفر نے تو ان کی ہڈیاں ہلاماری تھیں اور

اب ان کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو درد نہ کر رہا ہو اور یہ سب چارلس کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ نہ ضد کرتا اور نہ وہ لوگ اس علاقے میں گھستے اس کے باوجود کسی نے اسے سرزنش نہ کی شاید اس لئے کہ وہ سب کے سب اپنے حالوں میں پریشان تھے۔ اندھیرا اتر چکا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اس قدر گہرا ہو گیا کہ کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ کوچوان راستہ دیکھ سکتا ہے۔ لیکن شاید اس اندھیرے میں بھی جہاں ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا۔ اسے شاید راستہ نظر آرہا تھا۔ کیونکہ کوچ گاڑی سیدھی سیدھی ناہموار سڑک پر بھاگی جارہی تھی اور پھر کوچ گاڑی میں جتے ہوئے گھوڑوں میں ایک گھوڑا احتجاجاً ہنسنا یا کوچوان نے کچھ بڑبڑا کر اور کچھ پچکار کر گھوڑے کی حوصلہ افزائی کی، دوسری ہلکی سی ہنسا ہٹ سنائی دی اور پھر چرچراتے اور کھڑکھڑاتے ہوئے پیسوں کی رفتار کم ہو گئی مسلسل ٹاپوں کی آواز غیر مسلسل ہو گئی اور پھر کوچ گاڑی اچانک رک گئی۔

اور چاروں مسافروں کے دل دھڑکنے لگے اور مختلف قسم کے خیالات ان کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔

”کیا ہوا؟“

”کیا ہم راستہ بھول گئے؟“

”ہم کہاں پہنچ گئے ہیں؟“

”میرے خدا! اب کیا ہوگا؟ اس ویرانے اور اندھیری رات میں ہم کہاں جائیں گے؟“

لیکن کچھ نہ ہوا تھا۔ وہ راستہ نہ بھولے تھے اور نہ ہی انہیں کیس جانے کی ضرورت تھی، کیونکہ وہ پہلی منزل تک پہنچ چکے تھے۔ سامنے سرائے تھی۔ کوچوان اپنی نشست سے اتر کر نیچے آگیا تھا اور سرائے کا مالک نانک چندی اینٹوں کے صحن کو

ہاتھوں میں شراب کے لبریز جام تھے اور آتشان میں بھڑکتے ہوئے شعلے اور شراب ان کے سرد اور تھکے ہوئے جسم میں خوشگوار گرمی پہنچا رہی تھی۔

چنانچہ وہ سستانے لگے۔ یعنی اس میں سے تین سستانے لگے البتہ چارلس کیسٹ کی رگوں میں تو گویا پارہ بھرا ہوا تھا اور وہ زیادہ دیر تک مچلا نہ بیٹھ سکتا تھا یورپ کی سیاحت کے خیال کا بیج اس کے دماغ میں پڑا تھا اور یہ تجویز اسی کی تھی چنانچہ اب وہ اس سفر کے ایک منٹ کو بھی ضائع کرنا نہ چاہتا تھا بلکہ وہ اس تفریح سے جس قدر لطف بھی حاصل کر سکتا تھا کر لیتا چاہتا تھا۔ اس کا شوق جنس غیر تسکین پذیر تھا اور نئے نئے تجربات حاصل کرنے نئے مقامات دیکھنے اور مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے کا اسے ہوا کا تھا۔ جب اس کے دوسرے ساتھی ان چوبی بیچوں پر بیٹھے سترہ تھے جو آرام وہ تو نہ تھے۔ لیکن جو ڈگر ڈگر ہلتے ہوئے بھی نہ تھے تو چارلس اپنی ناپختہ اور غلط جرمی ان نئے لوگوں پر آزار ہا تھا۔ پہلے اس نے سرائے کے مالک پر اور پھر ان لوگوں پر آزمائی جو اپنی شام گزارنے کے لئے اس سرائے کے ایک کونے میں آ بیٹھے تھے۔ یہ لوگ بڑے ہی کم گو معلوم ہوتے تھے ان میں سے چند مقامی زبان بولتے تھے۔ جس کا ایک لفظ بھی چارلس کے پلے نہ پڑتا تھا۔ دوسرے لوگ کچھ کچھ جرمن زبان جانتے تھے لیکن انکی زبان بھی چارلس کی جرمی کی طرح غلط سلا ٹوٹی پھوٹی اور بے ربط تھی۔ وہ چار ایسے تھے جو اجنبی لوگوں سے بات کرنا ہی نہ چاہتے تھے چنانچہ وہ ایک الگ گروہ بنائے آپس میں ہی بڑے رازدارانہ انداز میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

چارلس نے ان لوگوں کو ایک دودھ اپنی طرف سے شراب پلائی تو انکی بے رخی کھلنے لگی۔ اب وہ چارلس کی طرف دیکھ کے مسکرا رہے تھے۔ وہ چارلس کے ان سے باتیں کرنے کی کوشش پر سر ہلا رہے تھے اور جب ان کے سامنے چارلس کے خرچ

عبور کر کے دفعتاً "بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ کوچ گاڑی کا دروازہ کھول کر اپنے مہمانوں کو خوش آمدید کے انسانوں کے بولنے اور دوڑ دھوپ کی خوشگوار آوازیں سنائی دیں بہت سی کھڑکیاں کھل گئیں اور ان کھلی ہوئی کھڑکیوں اور ایک کھلے ہوئے دروازے میں سے خوف دور کر دینے والی روشنی باہر بہہ آئی علاقے کی ویرانی یکایک دور ہو گئی یا یوں کہو کہ اس ویران علاقے میں سفر کرنے کے بعد ہمارے یہ مسافر جیسے ایک دم سے سکون بخش نخلستان میں پہنچ گئے تھے جہاں ان کا استقبال کیا جا رہا تھا، جہاں انہیں سردی اور اندھیرے سے پناہ مل سکتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ انہیں کھانا اور آرام بھی مل سکتا تھا۔

مسافروں کے لئے کمرے تیار تھے سرائے چھوٹی سی تھی، اس کی چھت نیچی تھی اور فرنیچر قدیم طرز کا اور پرانا تھا۔ لیکن سرائے کا مالک بے حد مخلص معلوم ہوتا تھا اور ان دیوانے انگریزوں کی ہر خدمت کے لئے بلکہ ان کے قدموں میں بچھ جانے کے لئے تیار تھا۔ جو خدا جانے کیوں اتنی دور آئے تھے۔

گرم پانی کے جگ تیار کئے گئے۔ سرائے کے مالک نے سن رکھا تھا کہ انگریز سب سے پہلے نہانے کی رسم ادا کرتے اور بہت سا گرم پانی استعمال کرتے ہیں۔ مسافروں نے غسل کیا اور اپنے تھکے ہوئے جسموں کو بستر پر ڈال دیا اور جب تک انکی تکان دور ہو تب تک ان کے لئے کھانا نہ صرف تیار ہو چکا تھا بلکہ میز پر چٹا بھی جا چکا تھا۔

کھانا سادہ مگر لذیذ تھا اور وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر بڑے سے آتشان کے قریب بیٹھ چکے تھے اور اسکی دھواں آلود روشنی اور گرمی میں سترہ تھے آتشان میں لکڑیاں جھج رہی تھیں اور ان کے یہ چٹائے ہمارے مسافروں کو بڑے ہی سامعہ نواز معلوم ہو رہے تھے کیونکہ اب وہ رات بھر سو کر اپنی تھکن دور کر سکتے تھے۔۔۔۔۔ کیوں کہ اب وہ سرائے میں تھے۔۔۔۔۔ اور ان کے پیٹ بھر چکے تھے۔ اور ان کے

کی۔ اور اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھا۔

”واہ بڑے حاتم ہو تم۔“ ہیلن نے چارلس کی طرف دیکھ کر اور بھونٹیں اچکا کر کہا۔

لیکن ڈانٹا مسکرا رہی تھی۔ ہیلن کی زبان ٹیکھی تھی تو ڈانٹا کی بے حد شیریں، ہیلن کے منہ سے ہمیشہ اور طنزیہ جملے نکلا کرتے تھے لیکن ڈانٹا کی ہر بات دل کو خوش کرنے والی اور حوصلہ افزاء ہوتی تھی، ہیلن بے آب و گیاہ صحرا کے پتے ہوئے تکلیف دہ ریت کی طرح تھی ڈانٹا۔ وہ نخلستان تھی جہاں چارلس کو سکون، فرحت اور مسرت حاصل ہوتی تھی ڈانٹا کے صرف ہونٹ ہی نہیں آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں وہ اپنے شوہر کی ہر صحیح و غلط حرکت کو تعریفی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن ہیلن کی آنکھوں سے غصہ عیاں تھا۔ جیسے وہ جھگڑ پڑنے کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ چارلس کو اپنی بیوی کی جلد بہت پسند تھی۔ نرم اور چکنی اور وہ اپنا جسم ہر دفعہ پہلی رات کے سے جوش، شوق محبت و خلوص سے چارلس کے حوالے کر دیتی تھی۔ اور ہیلن..... خیر! یہ تو کسی طرح چارلس کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ ایلن اور ہیلن کبھی ایک دوسرے سے جسمانی لذت حاصل بھی کرتے ہوں گے۔ ایسے خشک مزاج لوگوں کے لئے، جن کی زندگی کا پہلا اور آخری مقصد روپیہ بچانا ہو کسی بھی قسم کی لذت کوئی معنی نہیں رکھتی اور زندگی کی آسائشیں انہیں خواہ مخواہ کے چونچلے معلوم ہوتے ہیں۔

ڈانٹا نے بڑی صفائی، پیار اور پیاسے کی طرح اپنا پیالہ چارلس کی طرف بڑھا دیا۔ اور موخرا لڑ کرنے صراحی جھکا کر اسے لبالب بھر دیا۔ صراحی اور پیالے کے لب ایک طویل بوتل کے بعد علیحدہ ہوئے تو چارلس ہیلن کی طرف گھوم گیا۔ لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”بہت زیادہ خرچ کرتے ہو تم“ وہ بولی ”آخر حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ ایسا بھی

رہی چارلس کی بھابی ہیلن تو اسے ایلن کی بیوی بنے سات یا آٹھ سال ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ اب بھی بڑی عمر کی کنواری یعنی غیر شادی شدہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی عمر تیس برس سے تجاوز کر چکی تھی اور وہ ہر طرف اور وہ پہلو سے خاص قبول صورت تھی، لیکن خدا جانے کیوں وہ اپنے بالوں کو پیچھے کی طرف بڑے ظالمانہ انداز سے کھینچ کر ان کا جوڑا باندھتی تھی اور اس وجہ سے اس کا چہرہ ستا ہوا اور وہ خود معمر معلوم ہوتی تھی اس کے ہونٹ ویسے ہی پتلے تھے۔ پھر ہیلن کی یہ بری عادت تھی کہ وہ انہیں ناپسندیدگی سے اپنے دانتوں میں کھینچ دیا لیتی یا یوں کہنے کہ انہیں چوسا کرتی تھی۔ چنانچہ وہ اور بھی پتلے معلوم ہوتے تھے۔ ہیلن کے خیالات اپنے شوہر کے خیالات سے مختلف نہ تھے چنانچہ وہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی کفایت شعاری کی تعریف کر کے اسے اور بھی کفایت شعار بنا رہی تھی۔ اور اس نے اپنی زندگی کے لئے جن سخت اصولوں کی تنظیم کی تھی۔ ہیلن اسے بھی ہوا دیتی تھی۔ چنانچہ جب چارلس اور اس کی بیوی ڈانٹا نے اس سے کہا کہ وہ اور ایلن بھی ان کے ساتھ سفر کو چلے چلیں تو ہیلن نے انکار کر دیا۔ لیکن خدا جانے کیا بات ہوئی کہ زندگی میں پہلی دفعہ ایلن نے اپنی بیوی کی مخالفت کی اور اپنی زندگی کی مخصوص ڈگر سے ہٹ کر وہ چارلس اور ڈانٹا کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ چنانچہ ہیلن بھی تیار ہو گئی اور اس وقت ہیلن اور ایلن کا ہتھما کے ایک دور افتادہ اور انجان خٹلے کے ایک چھوٹی اور سستی سرائے میں آشدان کے قریب ڈانٹا کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور یہ واقعی حیرت انگیز اوقات تھے۔

اور اب چارلس کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ نئے نئے دوست بنانے اور انہیں شراب پلانے کی خوشی میں وہ اپنے مسافروں کو اور ان کے خالی پیالوں کو بھول ہی گیا تھا۔ چنانچہ اس نے جلدی سے پتھر کی بھری ہوئی صراحی سرائے کے مالک سے حاصل

وہ لوگ نصف فاصلہ طے کر کے کمرے کے بیچ میں پہنچے تھے کہ دفعتاً "بڑے زور سے سرائے کا دروازہ کھلا اور رات کی تیز اور سرد ہوا کا ایک جھکڑ اندر دھنس آیا اور کمرے میں چھایا ہوا آتش دان کی لکڑیوں اور سگریٹوں کا دھواں جھکڑ کے اس فوری ہلے کی تاب نہ لا کر ایک دم سے چھت کی طرف اٹھا ایک چوڑے شانوں والا طویل القامت شخص دروازے میں کھڑا ہوا تھا اس نے راہبوں کا لباس پہن رکھا تھا اور وہ دروازے میں کھڑا گاہکوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس ملائمت کے برخلاف جو راہبوں سے مخصوص ہے اس شخص کے بشرے سے کرخنگی اور آنکھوں سے حقارت عیاں تھی گویا وہ ان لوگوں کو جو اس وقت سرائے میں موجود تھے، ذلیل سمجھ رہا ہے اس نے ایک ٹانگ سے ٹھوکر مار کر دھڑ سے دروازہ بند کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سرائے کے بالک کی طرف بڑھا۔



کیا کہ آدمی آگے پیچھے کا خیال ہی نہ کرے، اور تم جانو یہ لوگ بھی، جنہیں تم اتنی بہت سی شراب پلا رہے ہو تمہاری اس..... کیا کہتے ہیں..... سخاوت کو پسند نہیں کرتے۔" اور اس نے ایک بار پھر سر ہلا کر سرائے کے پورے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ لوگ تمہیں بیوقوف سمجھتے ہیں۔"

"میں جو کچھ کرتا ہوں خود اپنی تسکین اور اپنے مزے کے لئے کرتا ہوں۔ یعنی کسی اور کے لئے نہیں۔" چارلس نے بڑی رکھائی سے کہا اور ایلن کی طرف گھوم کر پوچھا۔ "کیوں بھی؟" آپ کو میری بے محل سخاوت ناپسند ہے؟" ایلن مسکرایا۔

"چارلس! تمہاری کسی بھی حرکت اور کسی بھی کام پر پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا فتویٰ صادر کرنے کی عادت میں ایک عرصے سے ترک کر چکا ہوں" وہ بولا۔ "حماقت بہر حال حماقت ہے۔" ہیلن نے کہا۔

ڈانٹا نے ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور مسکرا کر چارلس کی طرف دیکھا۔ یہ ان دونوں کی مخصوص مسکراہٹ تھی، خفیہ، محبت سے بھرپور اور پر معنی۔ اس مسکراہٹ کو صرف چارلس سمجھ سکتا تھا۔

"میرے خیال میں اب ہمیں سونا چاہئے چلکر" ڈانٹا نے کہا "کیونکہ صبح سب کو جلد اٹھنا ہے۔"

"کیا لعنتی کوچ گاڑی ہے وہ بھی جس میں ہم سفر کر رہے ہیں۔ میرا تو ایک ایک جوڑ درد کر رہا ہے۔" ہیلن نے کہا اور اس خوف سے وہ اٹھ کھڑی ہوئی کہ کہیں یہ لوگ اپنا خیال نہ بدل دیں "اس گاڑی میں دوبارہ سوار ہونے سے پہلے کم از کم میں تو لمبی تان کے سونا چاہتی ہوں۔"

میں جھونک دیا۔

سرائے کے مالک نے جلدی سے ایک بوڑھے شخص کی طرف دیکھا، پھر دوسری طرف اور پھر راہب کی طرف دیکھا۔

”فادر شینڈور.....“ اس نے کہنا شروع کیا،

”خدا جانے کیا گوبر بھرا ہے، تمہاری موٹی کھوپڑیوں میں“ راہب جس کا نام شینڈور تھا کرجا۔ ”کہ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟ وہ معاملہ ختم ہوا..... وہ عفریت نہیں رہا..... اس کے خاتمہ کو ایک نہ دو پورے دس برس ہو چکے۔“

سرائے کا یہ کمرہ جو چند منٹ پہلے خوشی کی آوازوں اور قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ اب قبر کی طرح خاموش تھا۔ وہاں موجود ہر شخص کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں، وہاں موجود ہر شخص کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ہر شخص سانس روکے کھڑا تھا۔

”آج رات“ فادر شینڈور غصے میں چیخا ”آج ہی رات کو میں نے ایک بچی کی لاش کو مسخ ہونے سے بچایا ہے برہائی وحشیانہ پن ہے یہ تو وہ لوگ اس لاش کے سینہ میں کھوٹا ٹھونکنے جارہے تھے کہ اتفاقاً میں وہاں پہنچ گیا اور میں نے سختی سے اور جبراً انہیں لاش کی بے حرمتی کرنے سے روک دیا۔ کس قدر جاہل ہو تم لوگ۔ اور جب یہ کارروائی کی جارہی تھی تو ایک پادری بھی وہاں موجود تھا۔ اس کبخت کی اجازت سے ہی اس بچی کی لاش کے سینے میں کھوٹا ٹھونکا جا رہا تھا۔ یہ انتہا ہے کیا تم لوگ کبھی اپنے آپ کو اس بیچا خوف اور وہم سے آزاد نہ کر سکو گے؟ وہ عفریت اب نہیں رہا۔ اس کے خاتمے کو دس برس کا عرصہ گزر گیا۔ بیوقوفوں۔“

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سب کے سب نظریں جھکائے خاموش کھڑے

چنانچہ فادر شینڈور غرا کر اور دانت پیس کر آشدان کے اور بھی قریب ہو گیا اور

”شکر اور گرم مصالحہ ڈال کر میرے لئے عمدہ سرخ شراب کی بوتل لے آؤ یا ہر موسم اس قدر خراب ہے کہ کوئی جانور بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ بولا۔

سرائے کے مالک کو یہ حکم دیکر وہ آشدان کی طرف گھوم گیا اور چھت کی ایک شہتیر سے لٹکی ہوئی کسی چیز سے اس کا سر ٹکرایا یہ لسن کے غنجوں کا ایک گلدستہ سا تھا۔ جو شہتیر سے بندھی ہوئی ایک رسی کے دوسرے سرے سے بندھا لٹک رہا تھا۔ راہب نے غصے کی ایک غراہٹ کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر وہ گلدستہ گھسیٹ لیا۔ اور بڑے غصہ کے عالم میں اسے فرش پر دے مارا۔

”ہم! اس عفریت کو دور کرنے کے لئے یہ لسن؟“ وہ بولا۔ ”میں کہتا ہوں اب وہ عفریت نہیں رہا۔ اور اگر ہے تو پھر یہ تمہارا ٹوٹکا اسے روک نہیں سکے گا۔“

اس نے جھک کر لسن کے غنجوں کا گلدستہ فرش پر سے اٹھایا اور اسے آشدان

اب پہلی دفعہ اسے اس سرائے میں چار اجنبیوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ایک لمبے
تکسودہ بڑی ناقدانہ نگاہوں سے ان کا جائزہ لیتا رہا۔ اور پھر اس کے بشرے کی کرخنگ
دفعاتاً ملائمت میں اور تند خوئی بشارت میں تبدیل ہو گئی وہ ڈانٹا کے سامنے بڑے
اخلاق سے جھک گیا اور موخر الذکر جواب میں مسکرا دی، اب فادر شینڈور ہیلن کی
طرف گھوم گیا۔ وہ بدستور ماتھے پر پل ڈالے اور ہونٹ بھیچنے خاموش کھڑی رہی۔

”ہا۔ آ۔“ فادر شینڈور کمرے کی طرف منہ اور آتش دان کی طرف پشت کر کے
کھڑا ہو گیا۔ اپنا چغہ ایک جھٹکے کے ساتھ اوپر اٹھایا اور اپنے کولھے سینکنے کے بعد بولا۔
”اب کچھ سکون ملا۔ یہ بھی غیبت ہے کہ کولھوں کو گرم کرنے کا سامان یہاں موجود
ہے ورنہ وہ تو برف کے تودے ہی بن گئے تھے۔“

”بڑا ہی دیدہ دلیر اور منہ پھٹ قسم کا مگر کافی مضبوط شخص ہے“ چارلس نے
سوچا۔ راہب ہوتے ہوئے بہادر اور دلیر ہے اور ان لوگوں میں سے ہے جو بے
جھجک اور تن تنها دنیا کا اور ہر خطرے کا مقابلہ کر لیتے ہیں۔ اور ذہن بھی خوف زدہ
نہیں ہوتے اور پھر یہ ان لوگوں میں سے بھی ہے جو بے دھڑک بیان کر دیتے ہیں اور
سامنے والے سے نہیں ڈرتے اور نہ ہی اس کے جذبات کا خیال کرتے ہیں کیونکہ
حقیقت بہر حال حقیقت ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ قابل تعریف اور پر
قوت شخص ہے یہ فادر شینڈور لیکن اس کا قرب خواہ مخواہ انسان کو بے چین کر دیتا
ہے۔

”واہ! میرے لئے زندگی کی صرف چند ہی سرسبزیاں باقی رہ گئی ہیں۔ اور ان میں
سے ایک یہ بھی ہے۔ بے حد لطف آ رہا ہے“ فادر شینڈور نے اپنا کولھوں پر ہاتھ بارا۔
”فادر!“ چارلس نے پوچھا۔ ”کیا واقعی آپ زندگی کی سرسبزیاں سنجیدگی سے
حاصل کرتے ہیں یا محض زبانی جمع خرچ ہے؟“

”ہاں بیٹے۔ سنجیدگی سے حاصل کرتا یا حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“
فادر شینڈور نے کہا۔

”حالانکہ آپ راہب ہیں؟“ چارلس نے کہا۔

”ہاں۔ حالانکہ میں راہب ہوں لیکن تارک الدنیا نہیں ہوں کہ زندگی کی
آسانشوں سے اپنے آپ کو الگ کر لوں۔“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”سنو صاحبزادے!
اس فانی دنیا میں جتنی بھی سرسبزیاں حاصل کر سکتے ہو کر لو کیونکہ دوسری دنیا کا تو یہ ہے کہ
..... ہر چند کیس کہ ہے، نہیں ہے..... یعنی وہاں اس دنیا کی سرسبزیاں کہاں حاصل
ہو گئی؟ یا پھر بہت کم ہوں گی۔“

ہیلن نے فادر شینڈور کے اس کفر پر دہلی زبان میں اعتراض کیا تو فادر کا سر آہستہ
سے اس کی طرف گھوم گیا۔

”بانو! کیا امکان ہو گا وہاں؟ ایں کیسا ہو گا؟ دونوں؟ اس کا ایندھن اور اس کے
شعلے یا.....“ اور اس نے اپنی گھٹی بھونکیں اچکا کر نگاہیں چھت کی طرف اٹھا دیں۔
مجھے یقین ہے کہ وہاں آتش دان کے سامنے اپنی دم گرم کرنے اور اس وقت سرائے کا
مالک شراب لیکر آیا تو فادر شینڈور نے اپنا مضبوط بازو اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”اور
مصالحہ دار شراب پینے کی سہولت تو میسر نہ ہو گی۔ یہ تو عارضی چیزیں ہیں۔ اور ہم ان
سے اسی دنیا میں لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ وہاں نہ تو چوڑے ٹھنڈے پڑ جائیں گے کہ
انہیں گرم کیا جاسکے اور نہ سرد ہو جائیں چلیں گی کہ مصالحہ دار شراب سے لطف اندوز
ہوا جاسکے۔ ہاں تو کیا اب میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ چار خوش باش انگریز کارہتھما میں
کیا کرنے تشریف لائے ہیں؟“

چنانچہ چارلس نے پہلے رسم تعارف ادا کی۔ پہلے اس نے اپنا پھر اپنی بیوی ڈانٹا،
اپنے بھائی ہالین اور اپنی بھالی ہیلن کا تعارف کرایا۔ فادر شینڈور ہر ایک کے سامنے

میں ان کی خبر گیری نہیں کرتا۔ اور یہ ان لوگوں کی بد قسمتی ہے وہاں کیلن برگ میں
تھیں ایسے تو ہم پرست، جاہل اور رجعت پسند لوگ نہ ملیں گے، میں چاہتا ہوں کہ تم
وہاں آجاؤ۔ خانقاہ میں قیام کر سکتے ہو۔ خانقاہ کے برادر تمہاری خاطر ودارات میں کوئی
کسر اٹھانہ رکھیں گے۔“

فادر شینڈور کی اس دعوت نے چارلس کا دل موہ لیا۔ بے حد دلچسپ تجربہ ہو گا۔
یہ اور انوکھا بھی اور پھر چارلس کو یہ بھی احساس ہوا تھا کہ خود شینڈور بے حد دلچسپ
اور رنگارنگ قسم کا آدمی ہے۔ چنانچہ کیلن برگ کی خانقاہ میں ان کا قیام یادگار رہے
گا۔ فادر شینڈور نے اپنی باتوں سے ایک نئی اور زلالی دنیا کے دروازے ان کے لئے
کھول دے گا۔

چنانچہ چارلس نے کہا۔ ”خیال تو بے حد عمدہ۔۔۔۔۔“
”ہم فادر کی یہ دعوت نہیں قبول کر سکتے“ ہیلن نے سختی سے کہا۔
”کیوں؟“ چارلس نے پوچھا۔

”اس لئے کہ ہمارا پروگرام، جو پہلے سے بن چکا ہے ہمیں اس راستے سے ادھر
ادھر ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔“
”اب بھی، ایسی بھی بے مروتی کیا۔“ چارلس نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ
پروگرام سے ذرا سا انحراف۔“

”چارلس! تم پاگل ہو گئے ہو۔“ ہیلن نے کہا۔
”اس میں پاگل ہونے کی کیا بات ہے بھائی۔ دراصل۔۔۔۔۔“
”دراصل یہ کہ“ ہیلن نے فیصلہ کن انداز میں کہا ”کل ہم جوزف باد کے لئے
روانہ ہو رہے ہیں۔“

یہ نام سنتے ہی فادر شینڈور چونکا۔

بڑی شائستگی سے جھک گیا۔ شراب کی ایک چسکی لی، غالباً مصالحوں سے حل نہ ہوا
تھا چنانچہ پیالے کو دو چار جھکولے دیئے اور پھر بولا۔
”اور مجھے فادر شینڈور کہتے ہیں کیلن برگ کی راہبوں کی خانقاہ کا صدر یعنی
ایبوت ہوں۔“

اور چارلس نے دماغ پر زور دے کر اس نقشے کی تصویر بنالی۔ جسے وہ لوگ اس سفر
پر روانہ ہونے سے پہلے اور اس پورے سفر میں بھی دیکھتے رہے تھے لیکن اسے یاد نہ
آیا کہ اس نے یہ نام اس نقشے میں کسی جگہ نہ دیکھا تھا۔
”کیلن برگ! کہیں قریب ہی ہے یہ جگہ؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ کافی دور ہے یہاں سے۔“ فادر شینڈور نے اپنا سر شراب کے پیالے پر
جھکا کر اس کی بھاپ زور سے ناک میں کھینچی اور پوچھا ”کہاں سفر کو چلے ہو؟“
”جی نہیں کچھ پہاڑ پر چڑھیں گے اور کچھ میر کریں گے۔“ چارلس نے جواب دیا
”سفر وسیلہ ظفر ہے۔۔۔۔۔ کم سے کم ہم نے تو یہی سنا ہے۔ سفر سے آدمی کے علم میں
اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی لوگ ایسا ہی کہتے ہیں۔“
”بہت خوب۔ لیکن تم جس علاقے میں سفر پر چلے ہو اس سے تمہیں کیا فائدہ
ہوگا؟ ان ویرانوں میں تم کہاں وسیلہ ظفر تلاش کرو گے اور یہ جاہل لوگ تمہارے علم
میں کیا اضافہ کریں گے؟“

اور فادر شینڈور نے سرائے میں بیٹھے اور کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ
کیا۔

”اپنے مریدوں کے متعلق آپ کے خیالات کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔“
”یہ میرے مرید نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں انہیں بروداشت بھی نہیں کر سکتا۔
ان کی صورتوں تک سے بے زار ہوں۔ اور پھر یہ لوگ میرے ماتحت نہیں ہیں۔ اور

”کیا کما تم نے کہ کہاں جا رہے ہو؟ تم لوگ“ اس نے پوچھا۔
”جوزف باد۔“

”ہم۔ مناسب ہوگا۔ کہ تم اپنا راستہ بدل دو۔“ اس نے بڑی سخت آواز میں کہا۔

اور اس کا لہجہ ایسا حکمانہ اور اس کا حکم ایسا خلاف توقع تھا کہ ہیلن گھبرا کر اختیار کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اگر کسی نے اس کے گال پر اچانک چائنا رسید کر ہوتا۔ تب بھی وہ اتنی نہ بوکھلاتی، ایلن ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ ایسے موقع پر وہ اپنی بیوی کی مدد کو دوڑ آتا تھا۔

”فادر! آپ کی دعوت کا شکریہ“ ایلن نے کہا ”بیشک ہم اسے قبول کر لیتے، لیکن افسوس ہے ہم روانہ ہونے سے پہلے مکمل پروگرام بنا چکے تھے اور اب اسے تبدیل کرنا خلاف عقل۔۔۔۔۔“

”اسے تبدیل کرنا نہیں بلکہ اس سے چپکے رہنا خلاف عقل ہے۔“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”میں تم کو کیلن برگ آنے پر مجبور نہیں کرتا یہ تمہارا معاملہ ہے اور نہ اپنی مرضی کی مالک ہو، جی چاہے وہاں آؤ اور جی چاہے تو کہیں اور چلے جاؤ لیکن ضرور کہوں گا کہ جوزف باد نہ جاؤ۔“

”ہم نے سنا ہے کہ بے حد خوبصورت جگہ ہے وہ“ ڈائٹا نے کہا۔

”ہاں ہاں۔ لیکن بلائیں اور آئیں بھی خوبصورت ہیں“ فادر شینڈور نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ ڈائٹا نے پوچھا۔

”۱۔ لروپا۔ بلا دوں۔“ فادر شینڈور بڑبڑایا۔

”۲۔ لروپا۔ بلا دوں!“ وہ کیا ہوتا ہے ایلن؟“ ہیلن نے سرگوشی میں پوچھا۔

”اس کے لفظی معنی تو ہیں رات کا مہیب جان لیوا سایہ، لیکن اس سے پادری کی

کیا مراد ہے، یہ میں نہیں جانتا۔“ ایلن نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

”میری مانو اور جوزف باد جانے کے ارادے ترک کر دو۔“ فادر شینڈور نے کہا۔

”لیکن فادر شینڈور! ہم لوگ اناڑی نہیں بلکہ تجربہ کار چڑھنے والے ہیں۔“

چارلس نے اسے یقین دلایا۔

”بیٹے! پہاڑ پر چڑھنے اترنے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے تم مجھے ایک سکی پادری سمجھ رہے ہو گے اور یہ بھی خیال کر رہے ہو گے کہ میں اپنے راہبوں کے لباس تک کا خیال نہیں کرتا اور یہ تمہارا خیال ایک حد تک صحیح بھی ہے لیکن میاں! میں چاہوں تو سنجیدہ بھی بن سکتا ہوں اور اس وقت میں سنجیدہ ہی ہوں مناسب ہوگا کہ تم لوگ جوزف باد سے دور ہی دور رہو۔“

”کیوں؟“

”اگر میں نے تمہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا تو شاید بلکہ یقیناً تم اس پر یقین نہ کرو گے۔ یہاں تک تو خیر ٹھیک ہے لیکن شاید یہ ہوگا کہ سب کچھ سن لینے کے بعد تم اسے ایک چیلنج یقین کرتے ہوئے وہاں جانے کے لئے بے چین ہو جاؤ گے اور اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔ اس سرائے میں موجود کسی بھی شخص کے سامنے تم جوزف باد کا نام لو اور تم دیکھو گے کہ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا ہے۔ یہ لوگ ایک ناقص راکٹ میں بیٹھ کر چاند پر جانے کے لئے تو تیار ہو جائیں گے لیکن جوزف باد کبھی نہ جائیں گے اور ان لوگوں کو دوسرے لوگ کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، جو جوزف اد کے آس پاس رہتے ہیں۔“

”لیکن کیوں؟“

”بس یہ نہ پوچھو۔ البتہ اتنا ضرور سن لو کہ کوئی تمہاری مدد نہ کرے گا کوئی تمہیں رش آمدید نہ کہے گا اور اگر خدا نخواستہ کچھ ہوا تو بہت برا ہوگا۔“

”کیا ہے۔“

چارلس جانتا تھا کہ یہ ایلن نے غلط نہ کہا تھا اس نے بڑی تفصیل اور باریک بینی سے اس نقشہ کا مطالعہ کیا تھا، اور ایک ایک راستہ، ایک مقام اور ایک ایک عمارت جو نقشے میں بتائی گئی ہے، اس کے ذہن میں محفوظ ہے۔

”نقشے میں نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ قصر سرے سے ہی نہیں“ شینڈور نے کہا۔ بہر حال اس قصر کے قریب نہ جانا اور اس نے جھک کر پہلے دونوں عورتوں کو اور پھر دونوں مردوں کو سلام کیا اور پلٹ کر دروازے کی طرف چل دیا، دروازے کے قریب چند لوگ کھڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے شینڈور کو آتا دیکھ کر وہ اسے راستہ دینے کے لئے دائیں بائیں ہٹ گئے۔

فادر شینڈور نے یوں جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھولا جیسے کواڑ کو چولوں سمیت اکھاڑ کر پھینک دے گا۔ وہ باہر نکل گیا اور دروازہ یوں دھڑ سے بند کیا گیا کہ کواڑوں کا نہ صرف چوکھٹا بلکہ چھت کے شہتیر بھی ہل گئے کچھ ہی دیر بعد گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی جو دور ہونے لگی دور ہو کر دم ہونے لگی۔ اور پھر خاموشی میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئی۔

سرائے میں سکون اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہاں موجود ہر شخص نے جیسے خطرہ ٹل جانے کے بعد اطمینان کا سانس لیا ہو لوگوں کے ہونٹ ہلے اور خاموشی کمرہ رفتہ رفتہ ایک بار پھر آوازوں سے پر ہو گیا، سرائے کا مالک صراخیاں اور خالی پیالے سینے لگا۔

”لینڈلارڈ! ایلن نے سرائے کے مالک سے پوچھا“ فادر شینڈور نے ایک قصر کے متعلق کچھ کہا تھا، تم جانتے ہو کہ یہ قصر کیسا ہے اور کہاں ہے؟“

سرائے کے مالک نے چونک کر نکھیوں سے ایلن کی طرف دیکھا۔

”اس علاقہ میں اور بھی بہت سے حسین مقامات ہیں۔ ان کی سیر کرو اور لطف اٹھاؤ۔ لیکن اس مقام کے قریب تک نہ جاؤ۔“

”جیسا کہ آپ نے کہا فادر۔“ چارلس بولا۔ ”یہ ہمارے لئے ایک چیلنج ہی ہے۔“

فادر شینڈور زخمی شیر کی طرح غرایا، اس کی آنکھوں سے شدید غصہ عیاں ہو گیا اور اس نے خالی پیالوں اٹھایا۔ جیسے اسے بڑے زور سے سامنے کی دیوار پر دے مارا۔ لیکن پھر چیخا۔

”لینڈلارڈ۔“

سرائے کا مالک دوڑا آیا اور اس نے فادر شینڈور کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا۔

”تمہارے سرائے کے اصطبل کے محافظ کے پاس میں اپنا گھوڑا چھوڑ کر آیا ہوں۔“ فادر شینڈور نے بڑی شاہانہ شان سے کہا۔ ”اس سے کہو کہ میرا گھوڑا دروازہ پر لے آئے۔“

سرائے کا مالک اس حکم کی تعمیل کے لئے روانہ ہو گیا تو فادر شینڈور پھر انگریز مسافروں کی طرح گھوم گیا۔

”تم لوگوں سے مل کر مجھے خوشی حاصل ہوئی ہے خدا تمہیں حفظ و امان میں رکھے، کاش کے تم لوگوں نے میرے مشورے پر عمل کر کے جوزف باد جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہوتا۔“ اور اس نے اپنے چوڑے کندھے اچکائے لیکن اگر تم میرے مشورے پر عمل نہیں کر رہے ہو، تو نہ سہی جاؤ۔ لیکن خدا را قصر سے دور ہی رہنا۔ بھولے سے بھی اس کے قریب نہ جانا۔“

”قصر!“ ایلن نے کہا۔ ”کون سا قصر؟ نقشے میں تو کوئی قصر نہیں ہے؟“ اگر ہو تو میری نظر سے پوشیدہ نہ رہتا، کیونکہ آپ جاننے میں نے بڑے غور سے اس کا مطالعہ

کر رہی تھی کہ وہ آجائے تو دونوں اپنے کمرے کی طرف چل دیں
”ہم کیا؟“ ہیلن نے تیز نظروں سے چارلس کی طرف دیکھا۔

”ہم یہ بھابی کہ اگر۔۔۔ اگر۔۔۔ واقعی وہ قصر موجود ہے۔ جس کا ذکر شینڈور نے
کیا ہے اور اگر وہ ہمارے راستے میں ہی پڑتا ہے یا اگر راستے سے بہت زیادہ ہٹ کر
نہیں ہے تو لگے ہاتھوں اس کی بھی سیر کر لی جائے“ آدھا ایک گھنٹہ ادھر ادھر ہو بھی گیا
تو اس سے کچھ زیادہ فرق نہ پڑے گا ایک تاریخی قصر ہی ہم دیکھ لیں گے اور کیا۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

”قصر؟“ وہ بولا۔

”ہاں جوزف باد کے قریب ہے کہیں۔“

سرائے کے مالک کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ بے چین اور خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔
”میں کسی قصر سے واقف نہیں ہوں۔“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب

دیا۔

صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا سرائے کا مالک یقیناً اس قصر سے جس کا
ذکر شینڈور نے کیا تھا۔ واقف تھا لیکن وہ اس کے متعلق کچھ کہنا تو ایک طرف رہا۔
اس کے متعلق سوچنا بھی نہ چاہتا تھا چنانچہ اس خوف سے کہ یہ مسافر اس پر اسرار قصر
سے متعلق کچھ اور نہ پوچھ بیٹھیں وہ قصداً وہاں سے ٹل گیا۔

”یہ اس قدر خوف زدہ کیوں ہو گیا؟“ ڈائنا نے پوچھا۔

”شینڈور کو دیکھ کر سب ہی خوفزدہ ہو گئے تھے۔ غالباً اس سے ہر شخص ڈرتا

ہے۔“ چارلس نے کہا۔

ہیلن نے کہا۔ ”اگر ہمیں وقت پر جوزف باد پہنچنا اور وہاں تفریح۔۔۔“

”لیکن۔۔۔“ چارلس نے سر کھجایا۔

”لیکن یہ کہ ہمارے پاس اتنا وقت تو نہیں ہے کہ راستے میں رک کر ان قصروں

کو تلاش کرتے پھریں جن کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔“ ایلن نے اپنی بیوی کے دلکی

بات کہہ دی۔

”ہم شروع میں ہی اپنا پروگرام بنا چکے اور وقت کا تعین کر چکے ہیں۔“

ہیلن بولی۔ ”اور ہمیں آخر تک اس پر عمل کرنا ہے۔“

”ہم۔“ چارلس نے سر ہلایا۔

اور اس نے ڈائنا کی طرف دیکھا جو زینہ کے قریب کھڑی اپنے شوہر کا انتظار

باب - ۲

ایک چوراہے پر ان کی کڑکڑاتی ہوئی کوچ گاڑی دھتا " رک گئی یہ چوتھی دفعہ گاڑی روکی گئی تھی اس سے پہلے بھی تین دفعہ کوچ گاڑی راستہ میں بے وجہ ہی رکی تھی جس کی وجہ سے کوچوان نے گاڑی روک لی ہو البتہ ایک دفعہ گاڑی روکنے کی وجہ جلد ہی ظاہر ہو گئی تھی۔ گاڑی کا ایک پیہ راستہ کے کنارے والے کھڈ میں پھنس گیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ایک نہ دوپورے چار گھنٹوں کی تاخیر کے بعد وہ لوگ آگے روانہ ہو سکے تھے۔

لندن میں بیٹھ کر ان لوگوں نے جو پروگرام بنایا تھا اور جس طرح وقت کا تعین کیا تھا کہ اتنے بجے فلاں مقام سے روانہ ہو کر اتنے بجے تک فلاں مقام پر ضرور پہنچ جائیں گے سو اس پر ٹھیک سے عمل کرنا کم سے کم اس علاقہ میں تو ممکن نہ تھا۔ پروگرام بناتے وقت راستہ کی دقتوں، گاڑی کے ٹوٹنے پھوٹنے یہاں کے لوگوں کی بے مروتی اور عدم تعاون کا ان مسافروں نے خیال ہی نہ کیا تھا اور اس کا خیال کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہر جگہ ان کا استقبال کیا جائیگا لوگ بڑی مہمان نوازی اور تعاون کا ثبوت دیں گے اور وہ لوگ بڑے مزے سے بلاتا خیر اور کسی بھی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر اپنا سفر جاری رکھ سکیں گے۔ لیکن ان کے یہ سب اندازے غلط ثابت ہو رہے تھے۔

"کوچوان کو خدا جانے کیا ہو گیا تھا۔ کہ وہ خواہ مخواہ دیر کر رہا تھا" وقت اور بے وقت اور بلا وجہ گھوڑوں کی لگائیں کھینچ کر گاڑی روک لیتا تھا وہ پاگل تو معلوم نہ ہوتا تھا پھر کیا وجہ تھی کہ اب یہ چوتھی دفعہ اس نے گاڑی روک دی تھی۔"

چارلس اب برداشت نہ کر سکتا تھا اس نے دانت پیسے، منہ میں کوچوان کو دو چار

ملواتیں سنائیں اور کوچ گاڑی کا ایک طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دوسرا دروازہ کھول کے ایلن نے اپنی روانیتی شان سے باہر قدم رکھا وہ نہ تو غصہ کا اظہار کر رہا تھا اور نہ بے چینی کا۔

"اب کیا ہوا۔" چارلس نے غصہ دبائے کے لئے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھیج لیں۔

"میں آپ لوگوں کو اسی جگہ اتار رہا ہوں۔ ٹھیک ہے؟" کوچوان نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"کیا۔ آ۔ آ۔!" چارلس چیخا۔

"آپ لوگ اسی جگہ اتر جائیں گے صاحب۔" کوچوان بولا۔

"یعنی یہ کیا مذاق ہے! ہم "یہاں کیوں اترنے لگے؟" چارلس نے حیرت سے کہا۔ "اور تم ہمیں یہاں کیوں اتارنے لگے؟"

چارلس نے چاروں طرف دیکھا۔ چوراہے سے ہٹ کر کسی لکڑہارے کی جھونپڑی نظر آئی۔ لیکن وہ خالی پڑی تھی۔ دور دور تک کسی آبادی اور کسی انسان کا پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف عجیب ویرانی اور وحشت برس رہی تھی معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہاں کبھی کوئی آیا نہیں، مکمل ترین خاموشی بل کھاتا ہوا راستہ اور اندھیرا آسمان جو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جھکا آ رہا ہو۔

"یہ جوزف باد تو نہیں ہے۔" چارلس نے کہا۔

"یہاں یا تو کچھ گڑبڑ ہے۔ یا پھر ہم میں جو کچھ طے ہوا ہے وہ صاف نہ تھا۔" ایلن نے کہا "چنانچہ اب مناسب ہو گا کہ ہم ساری باتیں صاف کر لیں۔ غالباً ہم نے تم سے یہ طے کیا تھا کہ ہمیں جوزف باد پہنچا دو گے۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے" کوچوان نے کہا۔

ॐ नमो भगवते वासुदेवाय

”تو پھر یہ کہ آپ وہاں پیدل جاسکتے ہیں جو زف باد یہاں سے دور نہیں ہے۔“

”کیا۔ آ۔ آ۔“

”صرف دو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔“ کوچوان نے کہا۔

”پیدل جاسکتے ہیں!“ چارلس نے کہا۔ ”کوچوان! تمہاری عقل ٹھکانے پر ہے کہ

نہیں؟

”میری عقل تو ٹھکانے پر ہے صاحب۔ لیکن آپ کی نہیں ہے۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟..... یعنی..... کوئی دم میں اندھیرا تر آئے گا۔“

”اندھیرا۔!“ کو جوان کانپ گیا۔

اور اس نے سر اٹھا کر اندھیرے آسمان کی طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ کوچوان کی یہ گستاخی بے چین کر دینے والی تھی، چارلس نے اپنے دائیں ہاتھ کی منہی کھینچی۔ اس کا ارادہ تھا کہ کوچوان پر چھلانگ لگا دے اور اسے نیچے گھسیٹ کر مارے گھونسلوں سے اس کی عقل ٹھکانے لگا دے لیکن کوچوان شاید اس کے ارادے سے واقف ہو چکا تھا چنانچہ اس نے چابک گھسیٹ کر سر سے بلند کر لیا اور وہ چارلس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔

”ہم میں اور تم میں“ الین نے کہنا شروع کیا۔ ”یہ طے ہو چکا تھا.....“

”میں نے آپ کی پیشکش قبول کر کے غلطی کی ہے“ کوچوان نے کہا۔

”میں سمجھانہ تھا۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔“

”یہ تم جھوٹ بک رہے ہو۔ تم نے سب کچھ سمجھ کر ہی ہماری پیشکش قبول کی

تھی۔“

”براہ کرم آپ یہاں اتر جائیے۔ آپ سب اتر جائیے۔ میں یہاں سے آگے نہ

جاؤں گا۔“

”الو کے پٹھے، ملائق‘ کہئے۔“

چارلس برداشت نہ کر سکا اور اس نے اپنا گونہ بلند کیا۔ کوچوان نے چابک چلا دیا۔ اور وہ چارلس کے بائیں کان کے سڑا کے کی آواز پیدا کرتا ہوا جھک گیا ایلن گاڑی کے دوسری طرف کھڑا ہوا تھا وہ جلدی سے آگے بڑھا۔ اور گھوڑوں کے سروں کے سامنے سے گزرتا ہوا چارلس کے قریب آکھڑا ہوا۔ وہ اپنے بھائی کی مدد کو آیا تھا لیکن اس کی نگاہیں جیسے اتفاقاً چارلس کی پشت کی طرف اٹھ گئیں وہ حیرت سے پٹی ہوئی آنکھوں سے چارلس کے پیچھے دیکھنے لگا۔

”ہاں..... وہ..... دیکھو۔“ ایمن نے وہی آواز میں کہا۔

کوجوان کی گردن بے اختیار اس طرف گھوم گئی۔ جس طرف ایلن نے اشارہ کیا تھا وہ کانپ گیا۔ اور جیسے ہی جبراً اپنی گردن دوسری طرف گھما کر اس چیز پر نگاہیں ہٹانے میں کامیاب ہو گیا کوجوان اس کتے کی طرح کانپ رہا تھا جو سرد اندھیری اور طوفانی رات میں کسی سرد تالاب میں سے گر کر نکلا ہو۔

چارلس نے ایلن کی اٹھی ہوئی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔

”قصر!“ اس نے حیرت سے کہا۔

سرمدی دھندلے اور برف پوش پہاڑوں کے پس منظر میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہوا وہ قدیم اور عظیم الشان قصر کسی بھی سیاح کو اپنی طرف کھینچ سکتا تھا۔ قصر کے چاروں طرف دندانے دار اور اونچی پہاڑیاں تھیں جو شام کے اندھیرے میں دھندلی نظر آ رہی تھیں لیکن قصر کی بلند اور سنگین فصیل اور اس کے برج نظر آتے تھے فصیل اور برج بھی جگہ جگہ سے سیاہ ہو رہے تھے یہ غالباً کائی تھی جو قصر کی قدامت کا پتہ دیتی تھی۔

چارلس نے کوچوان کی ایک ٹانگ کو جھنجھوڑ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔
 ”کوئی جگہ ہے وہ؟ اس نے پوچھا؟“

”کوئی جگہ؟“ کوچوان نے انجان بن کر پوچھا۔
 ”وہ قعر! تم کئی دفعہ اس کے قریب سے گزرے ہو گے اور چونکہ اس علاقہ سے واقف ہو اس لئے اس قعر کا نام جانتے ہو گے کیا نام ہے اس کا؟“

”کونسا قعر؟“ کوچوان نے گویا آنکھیں بند کر کے پوچھا۔
 ”وہ کیا ہے اس پہاڑی کی چوٹی پر۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔۔“

”میں کوئی قعر نہیں دیکھ رہا۔“ کوچوان نے کہا۔

اور یہ اس نے غلط نہ کہا تھا۔ یقیناً وہ کوئی قعر نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ قصداً مخالف سمت دیکھ رہا تھا کوچوان اپنی جگہ پر بیٹھا ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

چارلس اب برداشت نہ کر سکتا تھا اس نے دوسرا ہاتھ بھی برسا کر کوچوان کی ٹانگ پکڑ لی کہ اسے گاڑی پر سے گھسیٹ کر نیچے ڈال دے۔ کوچوان نے بڑی کیننگی کا ثبوت دیتے ہوئے چارلس پر چابک چلا دیا۔ چابک کی رسی گنگنا اٹھی بے اختیار چارلس کے منہ سے ایک گالی نکل گئی اور اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ کوچوان کو نیچے گھسیٹ لیا اور اب وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے دھول میں لوٹ رہے تھے۔

چارلس کوچوان کی گرفت سے آزاد ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ایلن دوڑ کر چارلس کے قریب آگیا۔ اب وہ دو تھے اور کوچوان اکیلا تھا چنانچہ یقین تھا کہ وہ دونوں مل کر اسے زیر کر لیں گے۔ لیکن کوچوان جب اٹھ کھڑا ہوا تو اس کے دائیں ہاتھ میں ایک خطرناک چاقو تھا جو استرے کی طرح تیز تھا اور یہ بڑا سا پھل سورج کی آخری کرنوں میں اور آخری دھمکی آمیز انداز میں چمک رہا تھا۔

ایلن کے پیر تو جیسے زمین میں گڑ گئے چنانچہ وہ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ البتہ

چارلس آگے برسا اور کوچوان نے چاقو جھونکنے کے سے انداز میں اپنا ہاتھ اس کی طرف ایک جھٹکے سے برسا دیا۔
 ”بس بہت ہو چکا۔“ کوچوان نے کہا۔ ”اپنی عورتوں کو گاڑی میں سے اتار لو۔“
 چارلس اور ایلن بت بنے کھڑے رہے۔
 ”اتار لو۔“ کوچوان نے کڑک کر کہا۔

کوچوان کی آواز میں جو کڑک اور دھمکی تھی اس نے چارلس کو یقین دلادیا کہ اب بحث کرنا فضول تھا یہ نہ تو صحیح یا غلط کا سوال تھا نہ اخلاق اور بد اخلاق کا اور نہ ہی تہذیب اور بد تہذیب کا۔ کوچوان بد تمیز ہوا یا تمیز بد اخلاق ہوا یا خوش اخلاق بہر حال اس وقت اس کے سر پر بھوت سوار تھا وہ لوگ ایک اجنبی ملک کے غیر آباد اور ویران علاقے میں تھے کوچوان خوف اور غصے سے پاگل ہو رہا تھا چنانچہ خیمیت اسی میں نظر آتی تھی کہ اس سے بحث کرنے یا اخلاق و شائستگی کا سبق پڑھانے کے بجائے اس کے اس نادری حکم کی تعمیل کی جائے۔

چارلس کے ان خیالات کو ایلن نے زبان دی، ڈانٹا اور ہیلن گاڑی کی کھڑکیوں میں سے خوفزدہ اور پریشان نظروں سے باہر جھانک رہی تھی ایلن نے ان کی طرف ہاتھ ہلا کر کہا۔

”اتر آؤ۔“

”جی! ہیلن نے تھوک نکل کر کہا۔

”ارے بھی سنا نہیں کوچوان صاحب کا حکم؟ نیچے اتر آؤ۔“

دونوں عورتیں گاڑی میں سے اتر آئیں۔ ان کے نازک بوجھ تلے گاڑی کا پائیدان چرچا کر رہ گیا۔ دفعتاً کوچ گاڑی میں جھپٹے ہوئے گھوڑوں میں کا گھوڑا جھنڈنے اور زمین پر ٹاپ مارنے لگا، وہ کسی وجہ سے خوفزدہ معلوم ہوتا تھا اور ایسا لگتا

تھا جیسے وہ جلد از جلد وہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔

کوچوان کی طرح چارلس بھی کانپ رہا تھا، لیکن کوچوان کی کپکپی شاید خوف کی تھی اور چارلس کی حد سے بڑھے ہوئے غصے کی۔

”اس کی ایسی کی تھی۔“ چارلس نے دانت پیس کر کہا۔

چارلس دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر کوچوان کی طرف بڑھا۔

موخر الذکر نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا تو ڈانٹا نے اپنے شوہر کا بازو تھام لیا۔

”جانے دو چارلس۔“ ایلن نے بڑے خشک لہجہ میں کہا۔ ”یہ شخص ٹھک ہے

چنانچہ ہمارا سامان لے جانا چاہتا ہے۔“

کوچوان ایک لمحے تک جہاں تھا وہیں کھڑا رہا، اور پھر گاڑی پر جا چڑھا گاڑی کی

چھت پر ان چاروں کا سامان ایک رے بندھا رکھا ہوا تھا کوچوان کے چاقو کا پھل پھر

چکا اور ”کٹ“ سے رسہ کٹ گیا جس سے سامان بندھا ہوا تھا۔ ایک چوکور بکس کچھ

دیر تک چھت کے کنارے پر جھولا رہا اور پھر بڑی آواز کے ساتھ نیچے گرا۔ دوسرے

بکس آسانی سے نیچے پھسل آئے۔ دو بکس گاڑی کے ایک طرف اور تین دوسری

طرف گرے۔

ڈانٹا اور ہیلن گرتے بکسوں سے بچنے کے لئے جلدی سے کئی قدم پیچھے ہٹ

گئیں، چارلس نے ڈانٹا کی گرفت سے اپنا بازو چھڑایا اور آگے بڑھ کر اس چھوٹے

بکس کو پکڑ لیا جو ایک طرف لڑھکا جا رہا تھا۔

کوچوان نے اپنی جگہ بیٹھ کر لگا میں تھام لیں۔

”کل میں واپس آجاؤں گا۔ سورج طلوع ہو جانے کے بعد میں اسی جگہ آپ

لوگوں کا انتظار کروں گا۔ اور اگر آپ لوگوں میں سے کوئی یہاں موجود ہوا تو اسے

گاڑی میں بٹھا کر لے جاؤں گا۔ لیکن جوزف باد نہیں بلکہ واپس لے جاؤں گا۔ ہاں اگر

آپ موجود ہوئے۔“

اور اس سے پہلے کہ وہ اسے سمجھاتے، اس سے کوئی معاملہ طے کرتے کوچوان

نے چابک بجا کر گھوڑوں کو اشارہ دیا۔ گھوڑے پھنکار کر اور ہنسنا کر پیچھے ہٹے، گاڑی

کے پئے چڑھائے اور وہ اسی طرف گھوم گئی جس طرف سے وہ لوگ اس میں سوار ہو

کر آئے تھے۔

کوچوان نے سر اٹھا کر اندھیرے آسمان کی طرف اور پھر چاروں طرف دیکھا، اس

کے شرے سے انتہائی خوف عیاں تھا، اس نے اندھیرے میں جنگل کی طرف یوں دیکھا

جیسے اسے خوف تھا کہ درختوں کے میسب سایوں میں سے ان دیکھی بلائیں نکل آئیں

گی۔ اس نے جلدی جلدی اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور پاگلوں کی طرح گھوڑوں

پر چابک برسا دیئے۔ اور وہ خالی گاڑی کو لے کر حیرت انگیز تیزی سے بھاگ پڑے۔

اور وہ چاروں اس چوراہے پر کھڑے گاڑی کو اندھیرے میں غائب ہوتے دیکھتے

رہے۔

”وہ ٹھک تو نہ تھا۔“ چارلس نے کہا۔

”ہاں۔ نہ تھا۔“ ایلن بولا۔

”لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمارا سامان ہمارے پاس ہی رہ گیا اور یہ بھی غنیمت ہے

ورنہ کہاں تنگے بوچے مارے مارے پھرتے۔“

ہیلن کے مقابلے میں ڈانٹا کی عقل کچھ زیادہ منجھی ہوئی تھی اور بعض دفعہ وہ

بالکل منطقی اور صحیح سوال پوچھ جاتی تھی۔ چنانچہ اس نے پوچھا۔

”اگر وہ کل آکر ہمیں لے جانے کے لئے تیار ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ

آج ایسی بدحواسی سے کیوں بھاگ گیا؟ اگر وہ کل صبح سورج طلوع ہونے کے بعد یہاں

آسکا اور ہمیں لے جاسکتا ہے تو پھر۔۔۔۔۔“

قصیر

”بہت دور ہیں۔“ چارلس نے کہا۔

”ہاں۔ لیکن قریب آسکتے ہیں“ ڈائمنڈ نے کہا۔

”شاید وہ اس طرف نہ آئیں گے“

”لیکن۔ لیکن۔ میں نے تو سنا ہے کہ بھیڑیے یا تو رات گئے چلاتے ہیں یا پھر چاند

کو دیکھ کر بھونکتے ہیں۔“ ہیلن نے کہا۔

”بھائی! یہاں کے لوگ تڑالے ہیں چنانچہ بھیڑیے بھی تڑالے ہی ہوں گے“

چارلس نے ہنس کر کہا۔



”اند میرے سے دُرتا ہے پچارا“ چارلس نے سنجیدگی سے کہا۔

ڈانٹا نے چارلس کی طرف دیکھ کر منہ بنایا اور اپنی ناک اچکا دی اور پھر ان سایوں کا جائزہ لینے لگی جو ان چاموں کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہانٹوں اور درختوں کے سائے، چٹانوں کے سائے اور انسان کے بنائے ہوئے بے رنگ برہوں کے سائے۔ اور ڈانٹا نے نہ جانے کیوں خوف سے جھرجھری لے کر چارلس سے پوچھا۔

”یہ کہوان کے اندھیرے سے ڈرنے کی بات تم نے سنجیدگی سے کہی تھی؟“

”ارے نہیں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا“ چارلس نے جلدی سے جواب دیا۔

”یہاں کے عہدیداروں سے اس کی شکایت کرونی چاہئے۔ میرا مطلب ہے کہ کوچوان کی“ ہیلن نے پھنکار کر کہا ”شاید ہم اس کا لائنس منسوخ کروانے میں کامیاب ہو جائیں۔“

”میری اچھی بھابی یہ نہ بھولو کہ ہم لندن میں نہیں ہیں۔“ چارلس نے کہا۔ شاید یہاں عمدے دار ہیں ہی نہیں جن سے شکایت کی جاسکے۔ اور اگر ہوئے بھی تو وہ شاید ہماری مدد نہ کریں گے۔ اور یہ تو بہر حال بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال ہم تو اس اجازت جگہ کھڑے ہیں اور یہاں انسان تو انسان کوئی جانور تک نظر نہیں آتا۔“

”جانور شاید نہ ہوں لیکن درندے ضرور ہیں“ ڈائنا نے کہا۔ ”سنو! میں چند

آوازیں سن رہی ہوں۔ تم بھی سن رہے ہو یا میرا وہم ہے؟

چارلس اور ہیلن کان لگا کر سننے لگے۔ ڈانٹا نے غلط نہ کہا تھا۔ کہیں دور سے بہت دور سے آوازیں آرہی تھیں..... بھڑیوں کے چلانے کی آوازیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بھڑیوں کا پورا غول کہیں بیٹھا ایک آواز ہو کر چلا رہا تھا۔ یہ آوازیں بہت مدہم تھیں لیکن اس دیرانے کی خاموشی میں بڑی ہی بھیاںک اور لرزہ خیز معلوم ہوتی

”کوچوان نے قصر کے وجود سے کیوں انکار کر دیا۔؟“
”اے!“

”یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا لیکن کیا وجہ تھی کہ اس نے قصر کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ہمارے بار بار توجہ دلانے کے باوجود اس نے قصر کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا۔“
اور اب ان تینوں نے گردنیں گھما کر قصر کی دیکھا۔ وہ لوگ اب بھیڑیوں کو بھول چکے تھے۔

خدا جانے کیوں چارلس نے یقین کر لیا تھا کہ وہ قصر کھنڈر ہوگا۔ اس کے برج اور یہ فیصل غالباً یہاں سے سالم اور مضبوط نظر آتی ہوگی لیکن یہ برج اور یہ فیصل دراصل ایک خول ہوگا اور اس خول میں کچھ نہ ہوگا سوائے ٹوٹی ہوئی عمارت کی بے چھت اور تنگی دیواروں اور ٹوٹے پھوٹے ننگے ستونوں کے لیکن اب جو اس نے قصر کی طرف دیکھا۔ تو چونکا اور اسے اپنا پچھلا خیال بدلنا پڑا۔ قصر کی تین کھڑکیاں نہ صرف کھلی تھیں بلکہ روشن تھیں۔ ان کھڑکیوں کے پیچھے جو کمرے تھے یا جو کچھ بھی تھا ان میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ روشنی بہت دور ٹٹماتے ہوئے تین چھوٹے ستاروں کی طرح معلوم ہوتی تھی لیکن بے شک و شبہ وہ روشنی ہی تھی۔

”فادر شینڈور نے غلط نہ کہا تھا“ چارلس بولا ”قصر موجود ہے اور ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ ہاں اگر یہ نظر کا دھوکا ہو تو بات دوسری ہے۔ لیکن یہ نظر کا دھوکا ہوتا تو قصر ہم چاروں میں سے، بلکہ پانچ میں سے کیونکہ کوچوان بھی اس کے وجود سے واقف تھا، کسی ایک کو نظر آتا۔ لیکن چونکہ اس وقت ہم چاروں اسے بیک وقت دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے قصر ایک حقیقت ہے۔“

”لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر شخص اس کے وجود سے منکر کیوں ہے؟“
ایلن نے کہا ”کمال تو یہ ہے کہ نقشے میں بھی اس کی نشان دہی نہیں کی گئی۔ یہ بات

جس جگہ کوچوان نے انہیں اتارا تھا۔ وہاں سے قصر اندھیرے کے سوا اپنی پوری ہیبت کے ساتھ کھڑا آبی سائے کی طرح نظر آرہا تھا۔ یہ وہی قصر تھا۔ جو نقشے میں کہیں نہیں تھا۔ اس کے وجود کا کوئی نشان نہ تھا۔ ماسوائے فادر کے سب ہی اس کے منکر تھے۔ کوچوان نے خوف بھری نظروں سے اس قصر کو دیکھا تھا۔ کوچوان کی توجہ دلانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بالکل انجان بن گیا۔ جیسے کہ اس قصر کی طرف دیکھنا تو ایک طرف اس کی طرف رخ کرنا بھی گناہ ہو۔ اس سے اس قصر کے بارے میں معلوم کرنا بالکل بے سود تھا۔ وہ تو اس قصر کی طرف دیکھنا بھی نہ چاہتا تھا۔

ایلن ان سے چند فٹ دور کھڑا ان کے پیچھے کسی چیز کو دیکھنے میں محو تھا۔ چارلس ڈانٹا اور ہیلن قصر کو ایک نظر دیکھ کر اسے گویا بھول ہی گئے تھے لیکن اس قصر نے ایلن کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ اس وقت بھی اس پہاڑی پر کھڑے ہوئے عظیم الشان قصر کی طرف ایک عالم بے خودی میں دیکھ رہا تھا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔“ ایلن نے کہا۔
”کیا؟“ چارلس نے کہا۔

ایلن نے بھی کچھ کہے بغیر کندھے جھٹک دیئے۔
”میرے خدا! وہ کیا ہے؟“ ڈائنا نے کہا۔

اور ان سب نے اس طرف دیکھا جس طرف ڈائنا اشارہ کر رہی تھی، اندھیرے جنگل میں کچھ تھا، ایک نیلے رنگ کا ننھا سا شعلہ جو الف کی طرح سیدھا کھڑا تھا۔

”واقعی یہ کیا چیز ہو سکتی ہے“ چارلس نے کہا، شاید کسی جھوپڑی میں دیا جل رہا ہے۔“

”لیکن یہاں کوئی جھوپڑی نہ تھی۔“ ہیلن بولی۔ ”اور پھر اگر جھوپڑی میں دیا جل رہا ہوتا۔ تو دو باتیں ہوتیں۔ اول تو شعلہ سرخ ہوتا۔ اور پھر وہ زمین سے کافی اونچا ہوتا۔ لیکن یہ شعلہ نیلا ہے۔ اور جیسے زمین سے لگا ہوا ہے۔“

”تیں دیکھتا ہوں جا کر یہ کیا بلا ہے۔“ چارلس نے ایک قدم بڑھایا۔
”نہ جاؤ۔ خدا کے لئے نہ جاؤ۔“ ڈائنا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ”اور پھر بھیڑیے بھی شاید قریب آگئے ہیں۔“ ہیلن نے کانپ کر کہا۔

چارلس اور ہیلن بھیڑیوں کو واقعی بھول گئے تھے اب جو وہ اس طرف متوجہ ہوئے، تو ان کے چلانے کی آوازیں قریب سے، بہت ہی قریب سے سنائی دیں، صرف یہی نہیں بلکہ نیلے شعلے کے آس پاس چند سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔
”بھیڑیے!“ ڈائنا نے تقریباً چیخ کر کہا۔

”یہ شاید بھیڑیے نہیں ہیں۔ یہ تو کچھ غیر مادی چیزیں معلوم ہوتی ہیں“ چارلس نے کہا۔

”غیر مادی چیزیں کیا ہوتی ہیں؟“

”میں ان میں یقین نہیں رکھتا ورنہ کہہ دیتا کہ یہ بھوت پریت ہیں۔“ چارلس نے ہنس کر کہا۔ بہر حال ڈرو نہیں۔ اندھیرے جنگل تنہائی اور ایسی بھیانک رات میں

نہیں کہ قصر نیا ہو۔ خاصا قدیم ہے چنانچہ نقشہ بنانے والے اس کے وجود سے ناواقف ہوں یہ بات بعید از قیاس ہے۔“

”فادر شینڈر نے کہا تھا کہ ہم قصر کے قریب بھولے سے بھی نہ جائیں“ ڈائنا نے کہا۔

”اور میں فادر شینڈر سے متفق ہوں“ ہیلن نے کہا ”اس قصر میں یقیناً کوئی خاص بات ہے۔ خواہ مخواہ میرا دل دھڑکنے لگا ہے اور مجھ پر عجیب ہی طاری ہونے لگی ہے۔ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔“

چارلس نے حیرت سے اپنی بھابی کی طرف دیکھا آج یہ اس نے عجیب بات کہی تھی کہ اس کے دل پر بیت طاری ہونے لگی تھی۔ وہ ہیلن کو جانتا تھا۔ اور اس کے مزاج سے واقف تھا۔ نسوانی کمزوری کا اظہار کر کے خوفزدہ ہونا، یا بے ہوش ہو جانا۔ اس کے اصول کے خلاف تھا کوچوان کے گستاخانہ سلوک کے بعد اسے طعش آجانا چاہئے تھا۔ اور چارلس کو یقین تھا کہ ہیلن غصہ میں پیر پختی قصر کی طرف چل دے گی۔ ڈھلان چڑھ کر وہاں پہنچ جائے گی، اور دروازے پر دستک دے گی۔ بری شان سے ملکہ کی طرح اس میں داخل ہوگی اور قصر کے مکینوں کو حکم دے گی کہ فوراً کسی کو سرائے کی طرف دوڑا دیا جائے۔ بلکہ خود بادشاہ فرانس جوزف کے پاس آدمی بھیج کر اس نالائق کوچوان کی شکایت کی جائے اور اسے سزا دلوائی جائے لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس کے برخلاف وہ خوفزدہ تھی، اور فادر شینڈر کے اس مشورے سے متفق تھی کہ قصر کے قریب نہ جایا جائے۔

چارلس اپنے بھائی سے مشورہ کرنے لگا۔ کہ اب کیا کیا جائے، ایلن عمر میں بڑا ضرور تھا۔ لیکن ان لوگوں میں سے تھا۔ جن سے کبھی کوئی مشورہ کیا جاتا ہے۔ تو وہ شانے اچکا کر خاموش ہو رہتے اور اپنے آپ کو دوسروں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ چنانچہ

”اور پھر صبح۔۔۔۔۔“

دفعۃً اس کی آواز ڈوب گئی اور چارلس جھونپڑی کے دروازے میں سے نکل کر ڈانٹا کے قریب آکھڑا ہوا۔ اگر وہ بھوتوں پر یقین رکھتا تو یہ بھی یقین کر لیتا کہ یہ جنگل بھوتوں کا مسکن تھا۔ عجیب عجیب خلاف عقل باتیں ہو رہی تھیں یہاں۔

”بھینڑیوں کی آواز ایک دم سے بہت قریب آگئی تھی۔ جیسے وہ ان کے چاروں طرف پھیل گئے ہوں اور آہستہ آہستہ اپنا حلقہ تنگ کر رہے ہوں۔ اور جنگل میں اب ایک کے بجائے تین شعلے نظر آرہے تھے جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر الف کی طرف کھڑے تھے۔

اور اب وہ سب ایک اور آواز بھی سن رہے تھے دور سے آتی ہوئی مدہم آواز۔ یہ آواز کہیں سامنے سے اور جنگل میں سے آرہی تھی اور بڑی تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی، اور اب وہ چاروں بجھی کے گھوڑوں کے سازو سامان کی جھنکار، پیہوں کی کھڑکھڑاہٹ اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز صاف سن رہے تھے بجھی یا کوچ گاڑی یا جو کچھ بھی وہ تھی سیدھی ان کی طرف آرہی تھی۔

”معلوم ہوتا ہے اس گستاخ کوچوان کو ہماری حالت پر رحم آگیا ہے۔“

ایلن نے کہا۔ ”اور وہ حضرت اپنا ارادہ بدل کر صبح کے بجائے اسی وقت لینے آگئے ہیں۔“

”تمہارا خیال شاید غلط نہیں ہے۔“ ہیلن نے کہا۔

اور وہ لوگ جھونپڑی کے قریب کھڑے دیران چوراہے کی طرف پر امید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن یہ آواز اس سمت سے نہ آرہی تھی۔ جس طرف کوچوان اپنی کوچ لے کر بھاگ گیا تھا۔ یکایک اور خلاف توقع ایک بجھی قصر والے ٹیلے کی ڈھلان پر آگ آئی ہو۔ جھاڑیوں اور پھر درختوں کے جھنڈ میں سے نکل آئی۔ وہ

اوت پٹانگ چیزیں نظر آیا ہی کرتی ہیں۔“

”بہر حال بھیڑیے تو غیر مادی، ظاہر ہے کہ نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمیں کسی جگہ پناہ لینا چاہئے۔“ ایلن نے کہا۔

اور چارلس نے لکڑہارے کی جھونپڑی کی طرف ہاتھ ہلا کر کہا۔

”ہم آگ جلا کر اس جھونپڑی میں قیام کر سکتے ہیں۔“

”یہاں کھلی جگہ سے تو وہ جھونپڑی بہتر ہے“ ہیلن نے کہا۔

چنانچہ چارلس اور ایلن نے بڑے اور وزنی بکس اٹھائے اور چھوٹے اور ہلکے بکس عورتوں کے لئے چھوڑ دیئے۔ وہ چاروں جھونپڑی کے قریب پہنچ گئے، دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اس کی چولیس ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ اور کواڑ دہلیز کے پتھر پر آرہے تھے، چارلس نے کواڑ کو اپنے کندھے سے دھکا دیا تو وہ ایک چراگ کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

جھونپڑی تنگی اور خالی تھی۔ ایک کونے میں لکڑیوں کا انبار تھا۔ یہ ایندھن تھا۔ اس کے قریب خشک پھونک مٹنیاں احتیاط سے رکھی ہوئی تھیں۔

”رز ہوٹل کا سا تو آرام یہاں نہ ملے گا۔“ چارلس نے کہا ”لیکن پھر بھی غنیمت ہے۔“

ہیلن نے جھونپڑی کے دروازے میں کھڑے ہو کر ”سوں“ سے اندر کی ہوا سونگھی اس میں دھول اور قدامت کی بو تھی۔ بہر حال خود ہیلن نے کہا تھا کہ کھلی جگہ سے یہ جھونپڑی بہتر ہے۔ اور چارلس نے سوچا کہ قدرت کا یہ قرب اندھیرا، جنگل اور یہ بھیانک رات اس کی بھابی کا مزاج شاید بدل دے گی۔ اور خدا جانے کیوں اس نے ہیلن کی تکلیف کے خیال سے ہی اپنے دل میں مسرت کی لہری محسوس کی۔

”ہم جھونپڑی کے دروازے کے سامنے لاؤ جلا سکتے ہیں“ ڈانٹا کہہ رہی تھی

خطرناک تیزی سے تنگ اور ویران سڑکوں کے اتصال کی طرف بھاگی آرہی تھی۔ ایک کالے رنگ کی بکھی جسے دو بے حد عمدہ گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ اور ان گھوڑوں کا رنگ بھی کالا تھا۔

اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس بکھی کو چلانے اور گھوڑوں کو ہانکنے والا کوئی نہ تھا۔

بھڑیوں کی آوازیں یکایک خاموش ہو گئیں، نیلے شعلے دفعتاً جیسے بطن زمین میں اتر گئے۔

ڈانٹا نے اپنے شوہر چارلس کا بازو پکڑ لیا۔ اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور چارلس نے ان کے ناخنوں کو اپنی جلد میں اترتے محسوس کیا۔

ہیلن نے سرگوشی میں کچھ پوچھا۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا دریافت کر رہی تھی۔ گھبراہٹ کی وجہ سے اس کے الفاظ اوپر تلے گر کر گنڈھ ہو گئے تھے۔

ایلن نے کہا، ”اس بکھی کو ہم روک لیں۔“

”کوشش کرنی چاہئے“ چارلس نے کہا۔

اور وہ آگے بڑھ کر راستہ کے بیچ میں جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھادیئے۔

گھوڑے چارلس کی طرف بھاگے آرہے تھے ان کی گردنیں تلی ہوئی تھیں سر پیچھے کو ڈھلکے ہوئے تھے۔ اور ان کی لگائیں ہوا میں باریک دھاگوں کی طرح اڑاؤ لہرا رہی تھیں۔ جنگل کے اندھیرے مہیب سایوں میں ان گھوڑوں کے کالے جسم جیسے خود اپنی آگ میں جل رہے تھے ان کی سیاہ جلد سے ایک عجیب طرح کی مدہم روشنی پھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ ایک طرح کی دوزخی روشنی، بڑی غیر ارضی چمک تھی یہ۔

”چارلس۔۔۔ ڈانٹا چینی۔

گھوڑے بکھی کو کھینچتے ہوئے حیرت انگیز اور خطرناک تیزی سے بدستور بھاگے آرہے تھے۔ جیسے ہر اس چیز کو پکڑ کر رکھ دیں گے جو ان کی راہ میں حائل ہوگی۔

”چارلس! ہٹ جاؤ راستہ سے۔“ ڈانٹا چلائی۔

چارلس اپنی ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑا ہو گیا اب وہ تیار تھا کہ بکھی اور گھوڑے قریب آئیں، تو وہ اچھل کر ایک طرف ہٹ جائے اور قریب سے گزرتی ہوئی بکھی کے گھوڑوں کی لگائیں پکڑ کر انہیں روک لے۔ لیکن اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

چوراہے کے قریب پہنچ کر گھوڑوں نے دفعتاً اپنی رفتار کم کر دی اب وہ ہلکے چل رہے تھے اور پھر چارلس کے عین سامنے لیکن ان سے کوئی چھ فٹ دور آکر رک گئے دفعتاً جنگل کی خاموشی اور بھی گہری ہو گئی۔ دونوں گھوڑے خاموش کھڑے ایک دوسرے کی تھو تھنی چاٹ رہے تھے اور ایک دوسرے سے جیسے کچھ کہہ رہے تھے۔

”ہو۔ او۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔“ کہیں دور سے لکڑ بھگنے کی قہقہہ نما چیخ سنائی دی اور اس نے لمحہ بھر کے لئے خاموشی کی چادر میں شکاف ڈال دیا۔

چارلس آگے بڑھا۔

”ہو۔ ہو۔ ہی۔ آ۔ آ۔“ مردار خور لکڑ بھگ کسی پاگل شخص کی طرح چیخ پڑا۔

بھڑیئے خاموش تھے، وہ کہیں غائب ہو گئے تھے۔

چارلس گھوڑوں کے سامنے جا کھڑا ہوا پہلے اس نے ایک گھوڑے کے اور پھر دوسرے گھوڑے کے سر پر ہاتھ پھیرا وہ بد کے اور نہ نہنٹائے اس نے لگائیں پکڑ لیں گھوڑے اب بھی بے حرکت کھڑے رہے۔

ایلن آگے بڑھ کر اپنے بھائی کے قریب آ گیا۔

”بڑی حیرت انگیز بات ہے یہ تو“ وہ بولا۔

”چنانچہ اس حیرت انگیز بات سے یہ ثابت ہوا کہ معجزوں کا دور ابھی گزرا

نہیں۔“ چارلس نے کہا۔
 ”لیکن یہ بے کوجوان کی بگھی اور یہ گھوڑے۔۔۔۔۔“
 ”بھائی صاحب!“ چارلس مسکرایا۔ ”جو گھوڑے انعام کے طور پر مل جائیں، پھر ان کی نسل دیکھنا فضول ہے اور اس وقت تو عجیب یا غریب یا غیر عجیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب یہ گھوڑے اتفاقاً ایک بگھی بھی کھینچ رہے ہوں۔“
 ڈانٹا اور ہیلن سڑک کے کنارے ایک خوفناک اور بے چینی کے عالم میں کھڑی ہوئی تھیں۔

”چارلس! ایلن! نہیں۔“ ہیلن نے کہا۔ ”میرے دل میں ہول اٹھ رہا ہے۔“
 ”کیوں! ہول کیوں اٹھ رہا ہے؟“ چارلس نے پوچھا۔
 ”یہ۔۔۔ سب کچھ بے حد پر سرار ہے۔“ ہیلن نے کہا۔۔۔ ”سراسر غیر قدرتی ہے اور پھر۔۔۔ وہ بھیڑیے ایک دم سے کیوں خاموش ہو گئے؟ جیسے۔۔۔ جیسے۔۔۔ وہ کچھ جانتے ہوں۔“

اس سے تو چارلس کو بھی انکار نہ تھا کہ بے کوجوان کی بگھی کی آخر واقعی ایک ناقابل فہم اتفاق تھا۔ لیکن وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو ایسی بعید از فہم باتوں پر غور کرتے ہیں۔ اس کے خیال میں تو ایسے سفر میں اگر ایسے عجیب و غریب واقعات نہ ہوں۔ تو پھر سفر کا لطف ہی کیا؟
 ”تو پھر سوار ہو جائیں بھئی؟“ چارلس نے پوچھا۔

ہیلن اور ڈانٹا آپس میں اور نیچی آواز میں کچھ مشورہ کرنے لگیں۔ وہ دونوں اس پر اسرار بگھی میں سوار ہونے سے ہچکچا رہی تھیں۔ تاہم پادی النظر میں بگھی بے حد محفوظ آرام دہ اور عمدہ معلوم ہوتی تھی۔ اور گھوڑے بھی کوئل، سدھ ہو گئے۔ گھڑے اور تیز رفتار تھے۔ اور اگر وہ انہیں لے جا کر کسی بہتی کی سرائے میں پہنچا سکتے تھے تو

پھر یہ دونوں عورتیں اس بگھی کی اسرار پر اسراریت کو معاف کر دینے کے لئے تیار نہیں، لیکن یہ تو بعد کی باتیں تھیں فی الحال سوال یہ تھا کہ اس بگھی میں سوار ہونا مناسب ہو گا یا نہیں۔ جو اپنے آپ ہی اور وہ بھی اس قصر کی طرف سے چلی آئی تھی۔ جس کے قریب تک جانے سے قادر شینڈور نے سختی سے منع کر دیا تھا۔
 وہ دونوں کوئی فیصلہ نہ کر سکیں تو خود چارلس نے انہیں مجبور کر دیا۔
 ”ہم سامان چڑھائے دیتے ہیں۔ بھائی! آپ ذرا گھوڑوں کو تھامے رہیں۔“ اس نے کہا۔
 یہ بڑا فوری حکم تھا۔ اور ہیلن آگے بڑھنے کی بجائے کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔
 چارلس نے ڈانٹا کی طرف دیکھا۔ اور اس بات پر دل ہی دل میں فخر کئے بغیر نہ رہ سکا۔
 کہ ڈانٹا بڑی دلیری سے آگے بڑھی اور بڑی بے خوفی سے گھوڑوں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔
 سامان لاوا جا چکا۔ اندھیرا اور بھی گہرا ہو گیا تھا اور آسمان سیاہ روشنائی کے رنگ کا ہو رہا تھا۔ اور وہ ویران تھا۔ کہیں ایک ننھا سا ستارہ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ چنانچہ ان کو بڑے احتیاط سے اور دھیمی رفتار سفر کرنا تھا۔
 چارلس کو جوان کی نشست پر بیٹھ گیا اور اس نے لگائیں تھام لیں ایلن نے سارا دے کر پہلے ڈانٹا کو اور پھر ہیلن کو بگھی میں سوار کرایا۔ ہیلن کانپ رہی تھی اور اس کا جسم سرد ہو رہا تھا۔ اور پھر ایلن نے چارلس کی طرف دیکھا۔
 ”جوزف باد؟“ اس نے پوچھا۔
 ”جی ہاں۔ جوزف باد۔“ چارلس نے بڑے یقین سے جواب دیا۔
 ”تی۔ آ۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔“ لکڑکچے نے کہیں دور سے ایک قہقہہ لگایا۔
 جوزف باد، زیادہ دور نہ ہو گا۔۔۔۔۔ چارلس نے سوچا۔۔۔۔۔ اب سے کچھ ہی دیر بعد

طرف اندھیرا تھا البتہ سامنے اور پہاڑی کی چوٹی پر قصر کی کھلی ہوئی کھڑکیوں کی روشنی نظر آرہی تھی اور بس۔

چارلس نے پوری قوت سے لگائیں کھینچ لیں لیکن گھوڑوں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا، ان کی گردنیں بدستور تھیں رہیں اور وہ بدستور اس پر اسرار قصر کی طرف بڑھتے رہے جہاں سے وہ آئے تھے یا شاید بھیجے گئے تھے۔

گھوڑوں کو روکنے کی کوشش کرنا فضول تھا۔ چنانچہ چارلس نے انہیں روکنے کی کوشش ترک کر کے لگائیں ڈھیلی چھوڑ دیں رفتار نہ کم ہوئی اور نہ زیادہ وہ مناسب رفتار سے ڈھلان پر چڑھتے رہے چنانچہ اب کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا سوائے اس کے کہ صورتحال کو بڑے صبر و سکون سے قبول کر لیا جائے، بہت ممکن تھا کہ قصر کے کین بڑے مہمان نواز اور شریف لوگ ثابت ہوں انہیں کھلائیں پلائیں اور کوچوان کا بھی انتقام کر دیں جو انہیں جوزف باد تک پہنچا دے۔۔۔۔۔ چارلس نے سوچا۔۔۔۔۔ قصر کے مالک کے گھوڑے شاید بدک کر کسی وجہ سے خوفزدہ ہو کر کبھی لے کر بھاگ پڑے تھے اور چونکہ وہ لوگ گھوڑوں اور بکریوں کو واپس قصر تک پہنچا رہے تھے اس لئے قصر اور بکری کا مالک انہیں ان کے اس احسان کا صلہ ضرور دے گا۔

لیکن معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہ گھوڑے خود بھی جلد از جلد قصر تک پہنچ جانا چاہتے تھے، اس کے علاوہ وہ راستہ سے پوری طرح واقف تھے کیونکہ اندھیرے میں چارلس کو تو کچھ نظر نہیں آرہا تھا کہ لگاموں کے اشارے سے گھوڑوں کو اوپر اوڑھ کر موڑ سکتا تھا۔ چنانچہ گھوڑے خود ہی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے وہ راستہ میں پڑے ہوئے پتھروں اور درختوں سے بڑی مہارت سے بچ کر نکل رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی انجانی قوت ان کی راہبری کر رہی ہو۔

صبح بہت ہوا کے جھونکے چارلس کے چہرے کو ڈسنے لگے۔ قصر برف کی سرحد کے

وہ لوگ وہاں کی کسی عمدہ سرائے کے گرم کمرے میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہوں گے اور اس پر اسرار واقعہ اور اتفاق پر قہقہے لگا رہے ہوں گے اور وطن پہنچنے کے بعد جب اپنے دوستوں کو اس بے کوچوان کی پر اسرار بکری کا واقعہ سنائیں گے تو وہ بھی مارے حیرت کے دانتوں میں انگلی دے لیں گے۔

جب سے وہ لوگ بکری میں سوار ہوئے تھے تقریباً اسی وقت سے بھیرپوں کی آواز رفتہ رفتہ ابھرنے لگی تھی وہ پھر چلانے لگے تھے اور جنگل کے اندھیرے قلب میں ہم وی نیلا شعلہ نظر آرہا تھا۔

”کسی کی مدد ہوگی“ چارلس نے اس کی طرف اشارہ کر کے اور ہنس کر کہا۔
”تو اب چلو۔“ ایلن نے کہا۔

”ٹھ۔ ٹھ۔ ٹھ۔“ چارلس نے ٹھٹھا کے گھوڑوں کو لگام سے دو طرفہ جھاڑ دیا اور اسی وقت اس نے سوچا کہ خدا جانے گھوڑے ایک اجنبی کے حکم کی تعمیل کریں گے یا نہیں۔

گھوڑوں نے خاموشی اور فرماں برداری سے چند قدم آگے بڑھائے ان کا رخ اس سڑک کی طرف تھا جو جوزف باد جاتی تھی لیکن اس سڑک پر چلنے کے بجائے گھوڑوں نے یکایک اپنا رخ بدلا اور بکری زاویہ قائم بناتی دو سری طرف گھومنے لگی۔
چارلس نے چونک کر لگائیں کھینچ لیں۔

”بچ۔ واہ۔ وہ۔ بچ۔ اس طرف۔ اس طرف۔“ وہ گھوڑوں کو پکارتے لگا۔
لیکن نہیں، گھوڑے جیسے اس کا نہیں کسی اور کا حکم سن رہے تھے اور اب قصر تک جانے والا اندھیرا اور تقریباً نظر نہ آنے والا تھا، بکری کے پیروں تلے تھا بکری اسی راستہ پر چل پڑی۔ بکری کو کھینچتے ہوئے گھوڑے سبک رفتاری سے وہ پہاڑی ڈھلان چڑھنے لگے۔ جو چوڑا ہے سے چند گز کے فاصلہ سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ چارلس

معن میں شاید پتھر جڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ گھوٹوں کے کھروں کی آواز بڑے زور سے گونج رہی تھی، مختلف راستے معن کے بیچ میں ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے مختلف سمتوں میں جارہے تھے اور اندھیری محرابوں تلے جا کر غائب ہو گئے تھے۔

گھوٹوں نے ایک مختصر سا چکر کاٹا اور اب ابھی کی رفتار دھیمی پڑ گئی اور دوسرے ہی لمحے وہ قصر کے دروازے کے سامنے رک چکی تھی یہ ایک بے حد قدیم طرز کا دروازہ تھا۔ دروازوں میں گل میخیں جڑی ہوئی تھیں جو کسی زمانے میں جڑی گئی ہوں گی اور اس زمانے میں چمکدار رہی ہوگی لیکن اب وہ رنگ آلود تھیں اور اوپر سنگین محراب تھی قدیم اور مضبوط۔

وادئ میں روتے ہوئے بھیڑیے خاموش ہو گئے چیخا ہوا لکڑیہکا بھی خاموش ہو گیا۔

چاروں طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ غیر ارضی اور پرہیت چارلس نے برج کی چوٹی کی طرف دیکھا جس پر برف کی تہہ جھی ہوئی تھی اور پھر ایلن کی طرف دیکھا جو بڑے غصے کے عالم میں ابھی میں سے اتر رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہ تم پر کیا بھوت سوار ہوا کہ ہمیں یہاں لے آئے؟“

”بھوت مجھ پر نہیں بلکہ ان گھوٹوں پر سوار ہوا ہے۔“ چارلس نے جواب دیا۔ ”یعنی۔“

چارلس اپنی نشست پر سے اتر کر ایلن کے قریب آکھڑا ہوا۔ ”یعنی یہ کہ گھوٹوں کو میں نے لاکھ روکنے اور دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی لیکن یہ کبجنت ابھی سمیت ہم کو یہاں لے آئے“ چارلس نے کہا۔ ”یہ آپ نے غلط نہیں کہا شاید ان لعنتی جانوروں پر بھوت ہی سوار ہے یا یہ بذات خود بھوت ہیں۔“

دوسری طرف تھا اور جیسے جیسے ان کی ابھی آگے بڑھ رہی تھی پہاڑیوں کے اونچے نیچے خطوط زیادہ سے زیادہ واضح ہوتے جارہے تھے۔ برف سے ڈھکی ہوئی ڈھلان رات کے اندھیرے میں کسی یرقان زدہ کے رخساروں کی طرح زردہ مائل سفید ہو رہی تھی ہوا میٹھا بجارہی تھی۔ چند میل دور نظر آتی ہوئی ایک پہاڑ کی چوٹی کالے افق کے سینہ پر ایک سفید اور چپٹا داغ معلوم ہوتی تھی، درختوں کے پتے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نیچے وادی میں بھیڑیے بڑی بھیاں آواز میں رو رہے تھے اور کہیں دور شاید جنگل کے قلب میں کوئی لکڑیہکا بھوک سے بیتاب ہو کر چلا رہا تھا۔

بلندیوں پر سے اور ٹھیک قصر کی طرف سے ایک بڑی سی چگادڑ تیزی سے ہوا میں بہتی ہوئی آئی۔ کچھ دیر تک ابھی کے گھوٹوں کے عین سامنے فضا میں معلق رہی اور پھر چارلس کے سر سے ٹکراتی ہوئی کہیں پیچھے نکل گئی۔

ابھی ایک موڑ پر مڑی تو قصر کی کالی مہیب فیصل جیسے ایک دم سے درختوں میں سے نکل گئی۔ یہ منظر لمحے بھر تک ایک بلند چٹان کی اوٹ میں رہا۔ لیکن پھر ان کی ابھی قصر کی عظیم الشان بیرونی فیصل کی طرف بھاگی جاری تھی۔ گھوٹوں کی ٹاپیں اور ابھی کے پئے چوبی تختوں پر بڑی لرزہ خیز آواز میں بجائے چارلس نے دیکھا ابھی ایک چوبی پل سے گزر رہی تھی یہ پل ایک کافی چوڑی خندق پر بنا ہوا تھا۔ چارلس کو خندق سے پانی پر جھی ہوئی برف کی بھی ایک جھلک نظر آئی اس سے زیادہ کچھ اور نہ دیکھ سکا کیوں کہ ان کی ابھی بیرونی فیصل کے زبردست پھانک میں داخل ہو چکی تھی۔

پھانک کی بلند محراب میں شاید چگادڑیں سیرا کئے ہوئے تھیں، کیوں کہ وہاں سے عجیب طرح کی مدھم آوازیں آرہی تھیں اس سے پہلے کہ چارلس ان کی آوازوں کی نوعیت سمجھ سکا ابھی پھانک میں سے گزر کر قصر کے وسیع و عریض معن میں نکل آئی

”خواتین بھی تشریف لائیں۔“ وہ بولا۔

پہلے ہیلن اتر آئی۔ اس کے بشرے سے انتہائی خوف عیاں تھا، جسم جیسے یکھت
لے کے سخت ہو گیا تھا اور وہ عجیب پتھرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی
”مجھے۔ مجھے یہ جگہ پسند نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

”اس لکڑہارے کی جھونپڑی سے تو بہتر ہی ہے۔“ چارلس نے کہا۔

”لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن کیا۔؟۔۔۔“

”جب ہم یہاں آ رہے تھے تو بھیڑیے کیوں رو رہے تھے۔؟“

”ظاہر ہے کہ میں بھیڑیوں کی فطرت کا ماہر نہیں ہوں۔“ چارلس نے کہا۔

”البتہ اتنی سی بات تو کوئی بھی عقل سلیم رکھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ بھیڑیوں کو
رنے کی عادت ہی ہوتی ہے۔“

”لیکن وہ لکڑھٹکا؟“

”اے بھی چیخنے کی عادت ہے بھابی۔ آئیے۔“

”نہیں۔ چارلس نہیں“ ہیلن نے لرز کر کہا۔

”سمجھ میں نہیں آتا بھابی۔ کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے!“

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ بے حد بھیانک مقام ہے۔“

”چنانچہ ہم کم سے کم یہی معلوم کر لیں کہ کس قدر بھیانک ہے۔“

اور چارلس دروازے کی طرف بڑھا تو نیچے وادی میں بھیڑیے ایک بار پھر رو کر
اموش ہو گئے اور بکھی میں جتے ہوئے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے نے اپنا سر
ٹھایا، اس کے آرائشی سامان کی ہلکی سی جھنکار خاموشی میں گھڑی بھر کے لئے گونج گئی،
اور پھر گھوڑے نے بڑے زور سے پھنکار کر اپنا سر جھکالیا

”چارلس! اس وقت تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور۔۔۔۔۔“ ایلن نے کنا شروع
کیا۔

”بھائی صاحب!۔ اب تو خدا سے دعا کرو اور یہ امید رکھو کہ اس بکھی کا مالک ہم
گھوڑوں کی طرح مہمان نواز ثابت ہو۔“

ایلن نے مشکوک نظروں سے ویران صحن کی طرف دیکھا۔

”خدا جانے یہ کیا اسرار ہے! خود تمہارا کیا خیال ہے چارلس؟۔“ اس نے الجھ کر

پوچھا

”میرے خیال میں تو یہ گھوڑے قطعی گھوڑے نہیں ہیں۔“

”تو پھر کیا ہیں؟“

”گھوڑوں کے روپ میں خواجہ خضر ہیں جو بھٹکے ہوئے مسافروں کی مدد کرتے ہیں

انہیں راستہ دکھاتے اور شاید منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔“

”لیکن ہماری یہ منزل تو نہیں ہے۔“ ایلن نے کہا۔

اور اس نے اپنی نگاہیں قصر کے دروازے پر مرکوز کر دیں۔ اور چارلس کو یہ سمجھ

میں دیر نہ لگی کہ ایلن کیا سوچ رہا ہے ان کی آمد کی آوازوں سے صحن گونج اٹھا تھا

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز، بکھی کے پیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور پھر خود ان کی باتوں کا

آواز رات کی خاموشی میں دور دور تک سنی جاسکتی تھی، چنانچہ یہ واقعی عجیب بات تھی

کہ اب تک تو دروازہ کھلا تھا اور نہ کوئی باہر آیا تھا اگر انہیں خوش آمدید کہنے نہیں

دھکے دے کر انہیں بھگا دینے کے لئے ہی کسی کو تو باہر آنا چاہئے تھا۔

چارلس نے بڑے سکون کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”آؤ۔ بھائی، کم از کم قصر والوں کو سلام ہی کر لیں۔“

اور پھر وہ بکھی کی طرف گھوم گیا۔

باب-۳

دروازے کے دوسری طرف ایک وسیع وعریض کمرہ تھا۔ جس کی چھت بلند تھی اور جس کے انتہائی سرے پر ایک برآمدہ تھا۔ کمرے کے فرش سے برآمدے تک ایک بے حد خوبصورت اور چکر دار زینہ چلا گیا تھا۔ کمرے کی وسعت میں یہ زینہ کچھ اکیلا اکیلا سا معلوم ہو رہا تھا۔

چارلس قدم بڑھا کر اور دہلیز پھلانگ کر کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے کے فرش میں موٹے اور مضبوط پتھر جڑے ہوئے تھے اور دیواریں بھی پتھر کی تھیں۔ وہ بھی ضرورت سے زیادہ موٹی اور مضبوط معلوم ہوتی تھیں کمرے کے ایک کونے میں چھتھڑوں کا انبار تھا۔ لیکن ان چھتھڑوں پر کڑھے ہوئے نقش و نگار کے آثار اس بات کا پتہ دیتے تھے کہ کبھی یہ نہایت عمدہ پردے رہے ہوتے جو کمرے کی دیواروں کی ستر پوشی کیا کرتے ہوتے۔ ایک دیوار کی آغوش میں بڑا سا آستان تھا جس میں خشک لکڑیاں دھڑا دھڑا سگ رہی تھیں اندھیرے کے بعد اور باہر کی سردی محسوس کرنے کے بعد آستان میں اٹھتے ہوئے شعلوں کا منظر اور کمرے کی گرم فضا بڑی فرحت بخش تھی اور ان انگریز مسافروں کو گویا خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

”کوئی ہے؟“

چارلس کی آواز خالی کمرے میں گونج گئی۔ کوئی جواب نہ آیا۔

”ہم لوگ مسافر ہیں۔ کوئی صاحب ہیں یہاں؟“

اس کی آواز کمرے کی تنگی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی وہ انتظار کرنے لگا لیکن کوئی نہ آیا۔

تاہم صاف ظاہر تھا کہ اس قصر میں ضرور کوئی تھا کیونکہ آستان میں آگ یقیناً

ایک بار خاموشی طاری ہو گئی میب اور کھل ترین خاموشی۔

چارلس نے دروازہ کے قریب پہنچ کر اپنا ایک ہاتھ دستک دینے کے لئے اٹھایا۔ لیکن ابھی اس نے کواڑ چھوا بھی نہ تھا کہ وہ بڑی آہستگی اور بڑی خاموشی سے اندر کی طرف ایک آدھ انچ کھل گیا اور روشنی کی ایک موٹی سی لکیر باہر رینگ آئی۔

چارلس نے گردن گھما کر ایلن کی طرف دیکھا جو اس کے عین پیچھے اور صرف چہ قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا، دروازہ میں سے نکلتی ہوئی روشنی میں ایلن کا ایک رخسار داغدار تھا۔

”کیا خیال ہے۔“ چارلس نے پوچھا

”میرے خیال میں کوئی حرج نہیں۔“ ایلن نے جواب دیا۔

چارلس نے کواڑ کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ آہستہ سے کھل گیا۔



کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے، لیکن وہ خاموش رہا کیونکہ ہیلن پہلے ہی سے خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اور وہ اس کے خوف اور گھبراہٹ میں مزید اضافہ کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس کا تو اسے بھی اعتراف تھا کہ بات واقعی عجیب تھی پہلے تو بے کچوان کی بجھی بڑے پر اسرار طریقے سے آگئی۔ بجھی کے آتے ہی بھیڑیے چلانے اور لکڑی بھاگتے لگانے لگا۔ پھر گھوڑے اس کے قابو میں نہ رہے اور انہیں اس قصر کے دروازے پر لے آئے قصر میں شاید کوئی تھا نہیں حالانکہ چار آدمیوں کے لئے میز لگی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ بے حد عجیب اور پر اسرار تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا۔ تو چارلس اس قصر میں قدم نہ رکھتا۔ لیکن اس وقت صورت حال مختلف تھی۔ وہ قصر کے صحن کے کسی کونے میں یا بجھی میں بستر لگانے سے تو رہا۔ قسمت انہیں یہاں لے آئی تھی۔ چنانچہ یہ رات اسی قصر میں بسر کریں گے یا کم سے کم اس وقت واپس نہ جائیں گے جب تک کہ قصر کے مالک سے ملکر اپنا اطمینان نہیں کر لیتے۔

وہ بے ڈھڑک آگے بڑھ کر کمرے میں پہنچ گیا اس کے ساتھی بھی قدرے شش و پنج کے بعد اندر آگئے۔ وہ لوگ دروازہ سے کئی قدم آگے بڑھ چکے تھے کہ دفعتاً ایک آواز صاف طور سے سنائی دی گھوڑوں کے ٹاپوں اور بجھی کے پتھریلے صحن پر گھومتے ہوئی پیروں کی آواز بجھی کو گھوڑے کھینچنے لگے تھے۔

حیرت اور گھبراہٹ کی ایک چیخ کے ساتھ ہیلن دروازے کی طرف گھوم گیا۔ دونوں عورتوں کو دائیں بائیں ڈھکیل کر وہ دروازے کی طرف دوڑا۔ اور دوسرے لمحے وہ دروازے میں سے نکل کر ایک بار پھر رات کے اندھیرے اور سرد ہوا کے جھکڑوں میں کھڑا ہوا تھا۔

وہ پر اسرار بجھی جس پر ان کا کل سلمان لدا ہوا تھا مناسب رفتار سے بھاگتی ہوئی صحن عبور کر چکی تھی اور اب اس کے انتہائی سرے پر پہنچ کر ایک اندھیری محراب کے

تھوڑی دیر پہلے جلائی گئی تھی اور پھر اس میں ابھی ابھی چند تازہ ٹکڑے رکھے گئے تھے جو اب تک سگے نہ تھے۔ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا۔ لیکن چارلس نے اب جو کمرے کا جائزہ لیا تو اسے ایک اور حیرت انگیز بات نظر آئی، آتشدان کے قریب اور ذرا ہٹ کر ایک میز لگی ہوئی تھی، اور اس پر صرف چار آدمیوں کے لئے جگہ رکھی گئی تھی۔ میز لگی ہوئی تھی، چار آدمیوں کے لئے کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں لیکن وہاں کوئی شخص نہ تھا، سوائے چارلس کے۔ پورا کمرہ خالی تھا۔ کہیں کسی جاندار کی موجودگی کے آثار تک نظر نہ آرہے تھے۔

”ہیلو۔ کوئی ہے؟“

ایک بار پھر اس کی آواز تنگی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔

”سمجھ میں نہیں آتا کیا بات ہے۔ شاید قہروالے سویرے ہی سو جانے کے عادی

ہیں۔“ وہ بڑبڑایا۔

اور اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا، ہیلن اور ڈانٹا دبے پاؤں اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ اور اس کے دائیں بائیں کے کمرے میں جھانک رہی تھیں ایک طرف ہیلن بھی کھڑا ہوا تھا۔

”اب یہ قصر ظاہر ہے کہ آسیب زدہ نہیں ہو سکتا اچھا خاصا ہے اور شریف انسانوں کے لئے ہے۔“ چارلس نے کہا۔

”چارلس! ہم اندر نہ جائیں گے۔“ ہیلن نے آہستہ سے کہا۔

”بھائی! آپ کو میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ بھوتوں کا مسکن نہیں ہے۔“

”بھوتوں کا مسکن ہو یا“ انسانوں کا اس میں کوئی خاص بات ہے۔ ہم اندر نہ جائیں گے۔“ چارلس سے ہیلن نے التجا کی۔

چارلس کا جی جاہا۔ کہ وہ کہہ دے کہ ہم اندر جائیں گے۔ اور ضرور جائیں گے

”عجیب بات ہے کہ یہاں ہماری آمد غیر متوقع نہیں ہے۔“
”کیا مطلب؟“

ڈانٹا نے چار کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”یہاں ہم بن بلائے مہمان نہیں ہیں۔“

”یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم؟“ ایلن نے کہا۔

”پہلے تو کبھی جو کسی طرف مڑی ہی نہیں بلکہ سیدھی یہاں لے آئی اور اب یہ کھانے کی میز جو صرف چار کرسیوں کے لئے لگائی گئی ہے۔ اور ہم چار ہی ہیں۔ چنانچہ یہاں حصارا انتظار ہو رہا تھا۔“ ڈانٹا کی آواز میں حیرت تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہ تو میں نہیں جانتی لیکن میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔“

چارلس کو اپنی بیوی سے بہت زیادہ محبت تھی اور وہ اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اس کا دل خوش کیا کرتا تھا۔ لیکن آج یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس سے اتفاق کرنے کے لئے ذرا بھی تیار نہ تھا۔ بلکہ وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی دم میں چار بے حد بزرگ قسم کے نوگ اس چکر دار زینے پر نمودار ہوں گے اور زینہ اتر کر خاموشی سے کھانے کی میز پر بیٹھ جائیں گے تاہم وہ یہ بھی چاہتا تھا بلکہ اس کی دعا مانگ رہا تھا کہ وہ اپنا بچا کھانا انہیں دے دیں۔ دفعتاً وہ شدید اور ناقابل برداشت بھوک محسوس کرنے لگا۔

اس نے اپنی نگاہیں چکر دار زینے پر گاڑ دیں جیسے وہ اپنی قوت ارادی سے یا سحر سے قعر کے کمینوں کو بلا لے گا، جیسے وہ اپنے جسم پر اس کی نگاہوں کی غائبانہ چیمیں اور اپنے دل میں اس کے بلاوے کی غائبانہ آواز سن کر برداشت نہ کر سکیں گے اور جس حال میں بیٹھے ہوں گے۔ اسی حال میں اٹھ کر ”لبیک“ ”لبیک“ کہتے چلے آئیں گے۔

”جلدی آجاؤ“ چارلس نے دل میں کہا ”تم جو کوئی بھی ہو جلدی آجاؤ تاکہ ہم

نیچے جا کر تاریکی میں غائب ہو رہی تھی۔

ہیلن کے منہ سے ایک ہلکی نکل گئی وہ یوں کانپ رہی تھی جیسے اسے جاڑا چڑھ آیا ہو۔

”میں جانتی تھی۔۔۔ میں جانتی تھی کہ کچھ ہو گا۔۔۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ہمیں یہاں نہ آنا چاہئے“ وہ بولی۔ ”اگر تم نے میری بات سن لی ہوتی چارلس اگر وہاں چوراہے پر تم نے میری بات مان لی ہوتی۔ تو اس وقت ہم اس مصیبت میں نہ پھنس گئے ہوتے۔“

”میری پیاری بھابی۔“ چارلس نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اگر میں نے آپ کی بات مان لی ہوتی۔ تو اس وقت ہم انگلستان میں ہوتے۔“

”بے شک۔ اور اس میں کیا برا ہوتا۔؟“

”بڑا تو کچھ نہ ہوتا۔ لیکن آپ خود ہی اپنی معلومات وسیع کرنا چاہتی تھیں۔“

”اگر تم اسے ایک عظیم سیاحت یا تعلیمی سفر یا خدا جانے کیا کچھ کہتے ہو تو۔“

”اگر یہ معرہ حل ہو گیا، اگر معلوم ہو گیا کہ یہ کیا اسرار ہے تو یقین کیجئے بھابی آپ کی معلومات میں نہ صرف اضافہ ہو گا۔ بلکہ یہ سفر بھی عمر بھر یاد رہیگا ایسے عجیب واقعات ہر ایک کے ساتھ نہیں ہوتے۔“

”یہ کیا فضول کی بحث کر رہے ہو تم دونوں“ ایلن نے کہا جو کمرے میں آگیا تھا۔

چارلس اور ہیلن خاموش ہو گئے ان چادروں نے پہلے باہر دیکھا۔۔۔ اندھیرا اور سرد ہوائیں۔۔۔ اوپھر آتش دان کی طرف دیکھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ اور سب سے پہلے ڈانٹا نے حرکت کی وہ میز کی طرف بڑھی وہ اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اور میز کا جائزہ لینے کے بعد اور کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے خاموش ہو رہی۔

”کیا بات ہے؟“ چارلس نے پوچھا۔

جو شاید دونخ سے نکل کر آئی تھی۔ وہ کانپ گیا۔ اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے سامنے نظر کی اور اس دفعہ اسے کچھ نظر آیا۔ گزرگاہ کے انتہائی سرے پر کچھ دو جلتی ہوئی آنکھیں۔ وہ آنکھیں فرش سے چند انچ بلند تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چارلس کی طرف بڑھیں۔ پھر وہ اس کی طرف بھاگ پڑیں اور اس سے پہلے کہ چارلس ایک طرف ہٹ سکتا ایک غیر معمولی طور پر بڑا بلا اس کی ٹانگوں سے ٹکراتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

”اف! توبہ ہے“ اس نے اپنے خوف پر مسکرا کر ماتھے پر ہاتھ پھیرا تو وہ ٹھنڈے سینے سے غم ہو رہا تھا۔ یہ کیا حماقت ہے یار“

وہ آگے بڑھا اور اس دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا جو گزرگاہ میں پہلا دروازہ تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دستے پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمایا۔ دروازہ مقفل نہ تھا۔ دستہ گھوم گیا۔ چارلس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر دیکھا۔

یہ ایک آرام دہ کمرہ تھا، چھت سے ٹکٹا ہوا فانوس جل رہا تھا۔ آتشدان میں آگ جل رہی تھی، ایک طرف مسری تھی۔ جس پر بستر لگا ہوا تھا اور آتشدان کے سائے کمرے کی دیواروں پر ناچ رہے تھے۔ کسی کا شب خوابی کا لباس تنہ کیا ہوا مسری پر رکھا ہوا تھا۔

چارلس اٹنے قدموں واپس لوٹ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر مسری کے ایک طرف رکھے ہوئے سوٹ کیسوں پر پڑی وہ چونکا۔ لیکن پر دل ہی دل میں بولا کہ یہ اس کا وہم تھا۔ یا پھر آتش دان میں جلتی ہوئی آگ اس کی نظر کو دھوکا دے رہی تھی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو روک نہ سکا اور کمرے میں داخل ہو کر سوٹ کیسوں پر جھک گیا۔

تمہارے قصر میں گھس آنے کی معافی طلب کر لیں۔ پھر چند رسمی باتیں ہو جائیں تعارف ہو جائے اور پھر ہم سب میز پر بیٹھ کر پیٹ کی آگ بجھالیں۔ آجاؤ۔ جلدی آجاؤ۔“

اور وہ اپنے دل کی اس آواز پر آپ ہی آپ مسکرا اٹھا۔

”اول تو اس قصر میں کوئی ہے نہیں۔۔۔۔۔“ ڈانٹا نے کہنا شروع کیا۔

”نہیں کیسے ہے؟ یہ آتشدان میں جلتی ہوئی آگ اور یہ میز اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قصر غیر آباد نہیں ہے“ چارلس نے کہا۔

”اور اگر ہے“ ڈانٹا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو اس سے اس مہیب اور اعصاب پر سوار ہو جانے والی خاموشی کے لئے قطعی تیار نہ تھا جو اس کی اس پکار کا جواب تھی۔

گزرگاہ بدستور خاموش رہی، دروازے بدستور بند رہے۔ کسی طرف سے قدموں کی چاپ سنائی نہ دی۔ قصر خاموش تھا۔ قبر کی طرح خاموش تھا اور اب یہ خاموشی اسے بے چین کرنے لگی تھی۔ اگر نیچے کمرے کے آتشدان میں آگ نہ جل رہی ہوتی اور اگر یہاں اس کی گزرگاہ میں مشعلیں روشن نہ ہوتیں تو وہ یقین کر لیتا کہ یہ قصر عرصہ سے غیر آباد پڑا ہے، لیکن ایسی تو بات نہ تھی۔ قصر یقیناً غیر آباد نہ تھا پھر کیا وجہ تھی کہ یہاں کوئی نظر نہ آ رہا تھا؟ کیا وجہ تھی کہ اس کی پکار کا جواب نہ مل رہا تھا؟

ایک انجانا مگر موہوم سا خوف اس کے دل میں گھر کر کے لگا لیکن وہ واپس نیچے جا کر اپنے ساتھیوں کو یہ بھی بتانے کے لئے تیار نہ تھا کہ وہ بے نیل و مرام واپس آیا ہے۔

چند ثانیوں تک وہ خاموش کھڑا سوچتا رہا اور دفعتاً ”یوں محسوس ہوا جیسے اس گزرگاہ میں وہ اکیلا نہ تھا بلکہ کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا۔ کوئی غیر ارضی چیز کوئی روح

ہٹ گئیں۔

”آپ کا ہے؟“ چارلس نے پوچھا۔

الین کی زبان گنگ ہو گئی تھی چنانچہ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

چارلس کو گزر گاہ کے دوسرے دروازوں کا خیال آیا۔ وہ پلٹ کر کمرے سے نکل آیا۔ اس سے پہلے کمرے سے چند قدم آگے دوسرا دروازہ تھا۔ اس نے اس دروازہ کا دستہ گھمایا۔ پہلے دروازے کی طرح یہ بھی مقفل نہ تھا۔ چنانچہ یہ بھی کھل گیا۔ اس کمرے کے آئینہ میں بھی آگ جل رہی تھی۔ اس کمرے میں بھی مسہری تھی جس پر بستر لگا ہوا تھا۔ اور اس مسہری کے قریب بھی سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اب کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ اس سوٹ کیس سے جو سب سے اوپر رکھا ہوا تھا۔ وہ واقف تھا۔ یہ وہی سوٹ کیس تھا جسے وہ اس سفر میں کئی دفعہ کوچ گاڑی میں خود اپنے ہاتھوں سے رکھ چکا تھا۔ سوٹ کیس کے ڈمکن پر نام کے پہلے حروف جیلی حرفوں میں کندہ تھے۔ ”اے۔ کے“

وہ پلٹ کر کمرے سے باہر آیا۔ اور زینے کے سرے پر پہنچ گیا۔

”الین! ذرا اوپر آنا تو“ اس نے کہا۔

الین نے اپنا شوہر کو روکنے کے لئے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا لیکن وہ اس سے بچ کر زینے تک اور پھر زینہ چڑھ کر اپنے بھائی کے پاس پہنچ گیا۔

چارلس اسے اپنے ساتھ لے کر برآمدے میں چل پڑا، دروازے میں سے گزر کر گزر گاہ میں پہنچا اور پھر الین کو دروازے پر لے آیا۔

وہاں پہنچ کر۔ الین ٹھٹھکا۔

”نہیں۔ ہم اندر نہیں جاسکتے۔“ وہ بولا۔

”کیوں؟“

”یہ کسی کی خواب گاہ ہے۔“

”لیکن کس کی؟“

”یہ میں کیسے جان سکتا ہوں۔“

چارلس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے آیا

”یہ سوٹ کیس کس کا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

الین نے سوٹ کیس کی طرف دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سوٹ کیس کے

ڈمکن کو چھو کر دیکھا۔ وہ وہاں سے ہٹ کر مسہری کے قریب آکھڑا ہوا اور اس پر تہہ کر کے رکھا ہوا شب خوالی کا لباس اٹھا کر دیکھا اور مارے حیرت کے اس کی آنکھیں

سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس طرف دیکھنے لگا جس طرف دونوں عورتیں دیکھ رہی تھیں۔

وہاں ایک طویل القامت اور دہلا پتلا شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لمبوتر اور خشک سا تھا اور آنکھیں بڑی بڑی اور بھری ہوئی۔ وہ سر اٹھائے، سینہ تانے اور بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا۔ اس نے وجود پر جنازہ کا سا بالکل کالا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ ایک قدم بدھا کر روشنی میں آگیا اور اس کے زرد اور پر شکن چہرے پر کے مروحہ سے نفوش اور بھی گہرے اور بھیانک ہو گئے۔

”کیا مطلب ہے اس کا؟“ ایلن نے غرا کر کہا۔

اس بھوت جیسے شخص کی خلاف توقع آمد نے ایلن کو گویا چونکا دیا تھا اور اسے مجبور کر رکھ دیا تھا۔ کیوں کہ یہ شخص ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قبر سے نکل آیا ہو ایلن ان لوگوں میں سے تھا جنہیں بہت کم اور کبھی کبھی غصہ آتا ہے لیکن اول تو اپنی بیوی کی چیخوں کی وجہ سے اور پھر اس احساس سے کہ اس وقت وہ بے حد خوفزدہ تھی ایلن کو غصہ آگیا۔ ایسا شدید غصہ اور ساتھ ہی ساتھ حیرت و خوف سے ملے جلے جذبات اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔

”یعنی کیا مطلب ہے اس کا؟“ اس نے پھر پوچھا۔ اس دفعہ چیخ کر کہا۔

ہیلن نے ایسی آواز نکالی جیسے کتے کا پلا ”کوں۔ کوں“ کر رہا ہو۔

”اگر میں نے خواتین کو خوف زدہ کر دیا ہے جناب تو میں معافی چاہتا ہوں میرا مقصد یہ نہ تھا۔“

”اگر یہ مقصد نہ تھا تو پھر تم اس طرح کیوں نمودار ہوئے جیسے.....“ ایلن نے کہا شروع کیا۔

ہیلن نمایاں طور پر کانپ رہی تھی اور اپنی نگاہیں اجنبی پر سے ہٹانہ سکتی تھی۔

اور یہ سوٹ کیس اور یہ سلمان خود چارلس کا تھا۔ ایلن دروازے میں آکھڑا ہوا۔ ”یہ کیا اسرار ہے“ وہ بولا۔ ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یا تو ہمارا دماغ چل گیا ہے یا پھر۔“

ایک فلک شکاف چیخ نیچے کے کمرے میں سے بلند ہوئی۔ خاموش برآمدے میں سے گزرتی ہوئی گزر گاہ میں در آئی اور اس کی دیواروں سے ٹکرا کر خاموش ہو گئی۔ فوراً ہی دوسری چیخ سنائی دی۔

”میرے خدا! یہ ہیلن کی چیخ ہے“ ایلن نے کہا اور گزر گاہ میں بھاگ پڑا۔ چارلس اس کے پیچھے بھاگا۔ دونوں آگے پیچھے بھاگتے ہوئے گزر گاہ میں سے برآمدے میں آگئے اور بدستور بھاگتے ہوئے زینہ اترنے لگے۔

ہیلن کمرے کے بیچ میں کھڑی ہوئی تھی اور تیسری چیخ روکنے کے لئے اس نے اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی اپنے منہ میں ٹھونس رکھی تھی۔ ڈانٹا نے اپنا ایک ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیا تھا اور وہ دونوں اس طرف رخ کئے کھڑی تھیں جس طرف کمرے کی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ چارلس زینے کے مضبوط جھگے پر دونوں ہاتھ ٹیک کر اور

درجنوں خیالات ایلن اور چارلس کے دماغ میں گلبلا رہے تھے۔ اور وہ اس پراسرار اجنبی سے سینکڑوں سوالات پوچھنا چاہتے تھے لیکن معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہ شخص ان کے کسی سوال کا جواب نہ دے گا۔ اور اگر دیا بھی تو اس کا جواب گول مول ہوگا۔ جو انہیں کچھ زیادہ ہی الجھا دے گا۔ چارلس کو غصہ بھی آرہا تھا اور بے چین بھی تھا لیکن اس نے اپنے ان جذبات پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب رہا۔ اس کے علاوہ اسے اس کا بھی اعتراف تھا کہ وہ بھوکا تھا، بھوک اس کی آنتیں کھاری تھی چنانچہ وہ ہر جذبے پر غالب تھی اور اسے کچھ بھی سوچنے نہ دیتی تھی۔

چنانچہ اس نے اثبات میں سر ہلادیا اور اجنبی جس اندھیرے دروازے میں سے نمودار ہوا تھا اس میں گھس کر غائب ہو گیا۔

”چارلس!“ ہیلن نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہم“

”خدا کے لئے یہاں سے چلو“ وہ بولی ”ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا ہے۔“

”اس کا تو مجھے اعتراف ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے بے حد پراسرار ہے۔“

چارلس نے کہا۔ ”لیکن بھائی! میں بھوکا ہوں چنانچہ اس وقت میں کھانے کے علاوہ کسی اور چیز کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔“

”تمیں آپ سے متفق ہوں“ ڈانٹا نے سر ہلایا۔

”نہیں ڈانٹا نہیں“ ہیلن نے جلدی سے کہا۔

”کیوں؟ کیا برائی ہے اس میں؟ پندرہ منٹ پہلے کیا حالت تھی ہماری؟ ہم وہاں چڑا ہے پر سردی میں ٹھہر رہے تھے، کسی بھی بستی سے سیلوں دور تھے اور پریشان تھے کہ کیا کریں اور کہاں جائیں، اور اب ہم اس قصر میں ہیں، سردی سے محفوظ ہیں،

”اگر تم یہیں تھے، اور یقیناً تھے تو ہماری اتنی بہت سی آوازوں کا جواب کیوں نہ دیا؟ ہم پکارتے رہے اور تم کانوں میں تل ڈالے بیٹھے رہے۔ یہ کیسا مذاق تھا؟“

چارلس نے ایلن کی بات کاٹنے ہوئے کہا کیونکہ اسے خوف تھا کہ اس کا بھائی غصے میں کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جو اس اجنبی کو بری معلوم ہو۔

اجنبی کمر میں سے ذرا غم ہو گیا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو اور اس طرح وہ معافی طلب کر رہا ہو۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی لانی اور استخوانی انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔

”خواتین کو خوف زدہ کرنا میرا مقصد نہ تھا“ وہ بولا ”دراصل میں آپ کا سلمان کبھی پر سے اتار رہا تھا اور آپ کے لئے کمرے تیار کر رہا تھا۔ امید ہے کہ اپنے کمرے آپ کو پسند آئے ہوں گے۔“

”واہ! بے حد عمدہ۔ لیکن میں سمجھا نہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ ایلن نے کہا۔

”اور نہ ہی میری سمجھ میں کچھ آیا ہے۔“ چارلس سر ہلا کر بولا۔

اجنبی کے ہونٹ کھینچ گئے اور اس کے دانت نمایاں ہو گئے اگر اس انداز سے اجنبی یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ مسکرا رہا تھا تو وہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام رہا تھا۔ کیونکہ اس کے چہرے کا یہ انداز اور ہونٹوں کا کھینچاؤ مسکراہٹ سے کوسوں دور تھا۔

چارلس نے کہا۔ ”ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ.....“

”میرے آقا کی ممان نوازی مشہور ہے۔“ اجنبی نے جلدی سے کہا۔ اول تو یہ یہی نہیں جاننے کہ تمہارے آقا کون ہیں اور چونکہ ہم ان سے واقف نہیں ہیں اس لئے.....“

”حکم ہو تو میں کھانا لگا دوں؟“ اجنبی نے کہا۔

ہمارے لئے کمرے تیار کر دیئے گئے ہیں۔ ہمارے لئے کھانا چنا جا رہا ہے اور اگر اس پر اسرار ملازم کا آقا ایسا ہی ہوا جیسا کہ میں سمجھ رہی ہوں تو پھر ہماری تفریح طبع کا سامان بھی ہو جائے گا۔

”اور تم اسے کیا سمجھ رہی ہو؟“

”ایک بے حد اڑاؤ قسم کا نواب جو لوگوں کو حیرت زدہ کر کے محفوظ ہوتا ہے اور پھر اپنی مہمان نوازی کا سکہ جمانے کے لئے انہیں خوب کھلاتا پلاتا ہے اپنی تعریف کروانے کے لئے انہیں ہر طرح سے آرام پہنچاتا ہے۔ مطلب یہ کہ بے دریغ دولت لٹانے والا اور خوشامد پسند نواب۔ تم جانو دنیا میں اب بھی ایسے سکی مگر دلچسپ اور با مذاق لوگوں کی کمی نہیں۔

”آؤ بھی میز پر بیٹھ جائیں۔“ چارلس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اگر بحث کرنا ہے تو میز پر بیٹھ کر ہوگی۔“

ایلن نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے میز تک لے آئے لیکن وہ اپنی جگہ پر جم رہی۔ ایلن نے اسے کھینے کی کوشش کی تو وہ کانپ کر بولی۔

”ایلن نہیں۔“

”ہیلن! آج یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے!“ ایلن نے الجھ کر کہا۔ ”تم ایسی تو نہ تھیں آج تو کچھ خوف زدہ نظر آتی ہو حالانکہ پہلے میں نے تمہیں کبھی خوف زدہ ہوتے نہیں دیکھا۔“

”ایلن! میرا دل کتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے کوئی بھیانک واقعہ“

”کچھ ہونے والا نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم ڈٹ کر کھائیں گے گہری نیند سوئیں گے، صبح حسب وعدہ وہ نالائق کوچوان ہمیں لینے آجائے گا اور ہم روتا ہو جائیں گے۔ آؤ۔ آؤ بھی۔“

چند ثانیوں کے شش و پنج کے بعد وہ ایلن کے ساتھ میز کی طرف چلی دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ان لوگوں کو میز پر بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ وہی پر اسرار ملازم سوپ کی سروش دار قاب لے کر نمودار ہوا۔ اس نے سوپ کی قاب میز کے سرے پر رکھ دی اور خود اپنے ہاتھ سے ان قابوں میں سوپ ڈالنے لگا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ چارلس نے پوچھا۔

”صاحب! مجھے کلیو کہتے ہیں“ ملازم نے جواب دیا۔

”ہاں تو کلیو!“ چارلس نے میز کے گرد لگی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں چار کرسیاں کیوں ہیں؟“

”اس لئے صاحب آپ چار ہی ہیں۔“

”میرا مطلب یہ نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ تمہارے آقا کھانے میں شریک نہیں ہو رہے ہیں؟“

”جی نہیں صاحب“

”کیوں؟ یہ تو اصول میزبانی کے خلاف ہے“

”جی ہاں صاحب“

”تو پھر کیوں شریک نہیں ہو رہے؟ ان کی طبیعت کچھ نامناسب ہے کیا؟“

”جی نہیں“

”پھر کیا بات ہے؟“

کلیو ان کی پلیٹ میں سوپ رکھ چکا تھا چنانچہ اب وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اور اب اس نے چارلس کے سوال کا جواب دیا وہ کسی کو بھی چونکا دینے کے لئے کافی تھا۔ اس نے کہا۔

”صاحب! میرے آقا کا انتقال ہو چکا ہے۔“

آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کی گرمی کے باوجود چارلس کے رگ دریٹے میں سردی کی لہر دوڑ گئی اس کا پورا جسم برف ہو گیا۔ جیسے کوئی نظر نہ آنے والا دروازہ کھل گیا ہو۔۔۔۔۔ لیکن یہ دروازہ اس دنیا میں نہ کھلا ہو۔ بلکہ کوئی بے حد سزا اندھیری اور پراسرار دنیا میں کھل گیا ہو۔ جہاں سے غیر ارضی ٹھنڈک کی لہریں آ رہی ہوں۔ کلیو نے یہ الفاظ کچھ ایسے ٹھنڈے پن سے کہے تھے اور خود کلیو ایسا پرسکون نہ کہ پورا ماحول ہی پراسرار خوف زدہ کر دینے والا بن گیا تھا۔

”کلیو! یہ سب کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آیا اگر تم چاہو تو ہمیں بے وقوف کر سکتے ہو۔“ چارلس نے اپنی کانپتی ہوئی آواز کو راہ پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”لیکن اگر مناسب سمجھو تو ہمیں بتادو کہ ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟“

”کن باتوں کا صاحب“

”یہ۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ کھانے کی میز جو صرف چار آدمیوں کے لئے لگائی گئی۔۔۔۔۔ اور کمرے جو تیار ہیں ہمارے لئے۔۔۔۔۔ اور وہ بکھی جو ہمیں لینے آئی تھیں وغیرہ۔“

کلیو نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور کھانے کی میز پر بیٹھنے والوں کی طرف دیکھا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ وہ تقریر کرنے والا ہے بالکل اسی طرح جس طرح خاص دعوت میں میزبان کھانے کے بعد تقریر کرتا ہے۔

”صاحب!“ وہ بولا ”جیسا کہ میں نے کہا میرے آقا کا انتقال ہو چکا ہے لیکن ان کا حکم تھا کہ اس قصر کو ویران نہ ہونے دیا جائے بلکہ اسے ہمیشہ صاف ستھرا رکھ جائے اور جو بھی یہاں آئے اس کی خاطر مدارات کی جائے۔“

چنانچہ صاحب یہ قصر کسی بھی مہمان کے لئے کھلا ہے اور میں اپنے آقا کے

حکم کی تعمیل کر رہا ہوں اور اسی لئے آپ کو یہاں لے آیا ہوں۔“

”بڑے وفادار ملازم ہو تم۔ خیر تو کون تھے تمہارے یہ مرحوم آقا جن کی یہ آخری خواہش تم پوری کر رہے ہو؟“ کیا نام تھا ان کا۔؟“

کلیو نے اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھائی اپنی نظریں اٹھائیں اور اب وہ آتشدان کے ماتھے پر دیکھ رہا تھا۔ وہاں دیوار میں چسپاں زرہ بکتر جو غالباً خاندانی علامت تھی۔

”میرے آقا کا نام“ کونٹ ڈریکولا تھا۔“

”کونٹ ڈریکولا۔“

”جی ہاں! وہ ایک قدیم اور مشہور خاندان کے فرد تھے یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ان کی خدمت کا شرف حاصل ہوا۔“

”اب اس خطاب کا حامل کوئی نہیں ہے۔“

”جی نہیں! انہوں نے اپنے پیچھے کسی کو نہیں چھوڑا ہے جیسا کہ عام خیال ہے۔ اب میں معافی چاہوں گا۔“

وہ پلٹ کر جس طرف سے آیا تھا۔ اسی طرف چل دیا۔

ڈانٹانے کہا۔ ”انہوں نے اپنے پیچھے کسی کو نہیں چھوڑا ہے والی بات تو سمجھ میں آتی ہے اور صاف بھی ہے لیکن۔۔۔۔۔ جیسا کہ عام خیال ہے کہنے سے کلیو کا کیا مطلب تھا؟“

”ایک اور سوال جس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔“ چارلس نے سوچا۔

وہ سوپ کی قاب پر جھک گیا اور چچہ میں لے کر اسے چکھا اور فوراً ہی چٹکارہ لے کر اپنا سر ہلا کر سوپ بے حد لذیذ تھا اور اس نے دیکھا کہ ڈانٹا، ایلن اور ہیلن کو بھی سوپ پسند آیا تھا۔ چنانچہ وہ حل طلب مسائل کو بھول کر سوپ سڑپنے میں مصروف تھے اس پر پراسرار بکھی، قصر اور اس کے پراسرار ملازم کلیو کے متعلق ان کے دماغ

سے ہوئے تھا کہ ہم یہاں سردی میں ٹھہرتے رہیں گے لیکن اس کے برخلاف ہم یہاں بیٹھے مزے سے کھانا کھا رہے ہیں۔“

”وہ خوفزدہ تھا۔“ ہیلن نے کہا۔

”خوفزدہ تو تم سب ہی تھے لیکن۔۔۔ چارلس نے کہا۔

”خوفزدہ ہی نہیں بلکہ وہ سا ہوا تھا۔ اور احتمالی خوف سے پاگل ہو رہا تھا۔ جیسے

اے پتا ہو کہ یہاں کوئی بھیانک چیز ہو۔“ ہیلن نے کہا۔

”لیکن اس سے تو کسی کو انکار نہ ہوگا۔“ چارلس نے ہیلن کی بات سنی ان سنی

کر کے سلسلہ کلام جاری رکھا ”جب کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے کہ اس کا کوئی سربراہ

سمجھ میں نہیں آتا تو آدمی گھبرا جاتا ہے اور خوفزدہ بھی ہو جاتا ہے۔ یہ گویا فطری بات

ہے۔ تاہم بھابی اس سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ وہاں اس لکڑھارے کی

جمو پڑی میں ہم جو کھانا کھاتے وہ اتنا لذیذ نہ ہوتا جتنا یہ کھانا لذیذ ہے جو ہم اس وقت

ٹھونس رہے ہیں۔“

”میں اب بھی خوف زدہ ہوں۔“ ہیلن پہلے کی طرح اعصابی بیچن میں اب بھی جلا

معلوم ہوتی تھی تاہم اس کا حالیہ سکون کچھ زیادہ ہی بے چین کر دینے والا تھا۔ اس

قصر میں کوئی خاص بات ہے جو۔۔۔۔۔“

چارلس ایک بار پھر اس خیال سے بے چین ہونے لگا تھا کہ ہیلن پھر ہسٹریا کی

مرضیہ کی طرح چیخنے چلانے لگ جائیگی لیکن یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ

ایلن نے آگے کی طرف جھک کر اپنی بیوی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ابتداء میں ان

دونوں کے درمیان جذباتی رشتہ رہا ہوگا لیکن اب ان کے درمیان جو خشک مگر وفادارانہ

رشتہ قائم ہو چکا تھا وہ قابل احترام تھا بہت ممکن تھا کہ اب ان دونوں میں وہ تعلقات

قائم نہ ہوتے ہوں جو میاں بیوی کے لئے لازم و ملزوم ہیں تاہم جذباتیت کا ابتدائی دور

میں جو خیالات چکر لگا رہے تھے وہ اس وقت دماغ کے کسی تاریک گوشے میں عارضی

طور پر جا سوئے تھے۔ کونٹ ڈریکولا سے واقف نہ تھے۔ بلکہ انہوں نے اس کا نام بھی

نہ سنا تھا اور پھر چونکہ وہ مرد کا تھا اس لئے اس کے متعلق سوچنا حماقت تھی۔ یہ سب

کچھ اسرار سخی جو ان لوگوں کو ایک افسانہ معلوم ہوتا تھا۔ الف لیلہ کی وہ داستان

معلوم ہوتی تھی جس میں ماسکی کو بادشاہ بنا دیا جاتا۔ لیکن یہ نہ افسانہ تھا اور نہ داستان

بلکہ حقیقت تھی۔ کہ وہ کھانے کی میز پر بیٹھے تھے اور گرم و لذیذ سوپ پی رہے تھے

چارلس نے چپے رکھتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں کل صبح ہمیں مل جل جائے گا۔“

”مل۔! کاہے کاہل؟“

”قیام و طعام کا۔ اور کاہے کا۔“

ڈانٹا کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ کلیو نے یہ اعلان کر کے کہ قصر کے آقا کا انتقال

ہو چکا تھا۔ اس کے اس حسین تصور کے تار و پود تو پہلے ہی سے بکھیر دیئے تھے کہ اس

قصر کا پر اسرار مالک بے حد فیاض اور مہمان نواز قسم کا اور کوئی سکی شخص ہوگا اس کے

بادوجود یہ یقین کرنے کے لئے قطعی تیار نہ تھی کہ دوسرے دن انہیں قیام کرنے اور

کھانے کا بل مل جائے گا۔

”ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔“ وہ بولی۔ ”بہت عمدہ شخص ہوگا یہ کونٹ ڈریکولا کہ

اپنے وصیت نامہ میں یہ لکھ گیا کہ اس قصر کو مسافروں کے لئے کھلا رکھا جائے اور ان

کی خاطر مدارات کی جائے۔“

”لندن وغیرہ میں یہ بات ممکن ہے ہی نہیں۔ بہر حال معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں

الف لیلہ کے شہزادوں کی قسم کے نواب اب بھی موجود ہیں۔“ چارلس نے کہا اس

کوچوان نے ہمیں چوراہے پر پہنچ دیا تھا تو یہ گویا نادانستہ طور پر وہ ہم پر کرم کر گیا تھا۔ وہ

”یہ الفاظ اس کی زبان نے ادا کئے ہی تھے کہ بغیر کسی تمہید کے ایک کڑک کی آواز کہیں اوپر سے سنائی دی جو بڑی تیزی سے لڑھکتی ہوئی نیچے آئی اور غالباً یہ بجلی تھی۔ جو قصر کی چھت پر گری اور قصر اوپر سے نیچے تک بل گیا۔ کڑک کی آواز خاموش ہوئی تو کسی نظر نہ آنے والے پرند کے بازوؤں کی پھر پھر اڑت کی آواز ابھری۔ یہ شاید چنگاڑ تھی۔ ساتھ ہی نیچے وادی میں بھیڑیے دو ایک دفعہ رو کر خاموش ہو گئے۔ اور آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کے شعلے گھڑی بھر کے لئے یوں جھک گئے جیسے کسی کو

”انہیں کیا ضرورت تھی۔ کہ ہمیں اپنی خانقاہ میں بلانے کے لئے جھوٹ

باب - ۲

ایک عرصہ گزر چکا تھا ایک طویل مدت ہو چکی تھی ایک دور ختم ہو چکا تھا اور وہ انتظار کرتا رہا تھا۔ انتظار یہ عرصہ بے حد طویل تھا دس سال، جو انہیں دس صدیاں معلوم ہوئے تھے۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ کونٹ ڈریکولا کا نام سنتے ہی وادی کے لوگ لرز اٹھتے تھے ہاں وہ دور بھی تھا کہ جب کلیو کالے گھوڑوں والی بکلی میں بیٹھ کر بستی میں جاتا تھا۔ تو مائیں اپنے بچوں کو گھسیٹ کر سینے سے لگا لیتی تھیں، عورتیں کانپ کر گھروں کے کونوں میں دبک جاتی تھیں ڈریکولا کے نام کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اس کی ہیبت ہر دل پر طاری تھی وہ زمانہ بھی تھا جب بستی سے آئے دن بچے غائب ہو جاتے تھے۔ اور پھر ان کے رونے کی آواز قصر ڈریکولا کے کسی کمرے میں سنائی دیتی تھی، جب اچانک لڑکیوں کی شہ رگ پر دو نشانات نمودار ہو جاتے تھے اور پھر وہ لڑکی سفید ہونے لگتی تھی کیوں کہ ڈریکولا اس کا خون پیا کرتا تھا۔ اور پھر قبریں، اپنے دھلے کھول دیتی تھیں اور مرنے والیاں چڑیل بن کر اپنی قبروں سے نکل آتی تھیں۔ اور بستی سے بچے غائب ہونے لگتے تھے اور لوگوں کے دلوں میں کونٹ ڈریکولا کی ہیبت شدید سے شدید تر ہو جاتی تھی

لیکن اب وہ زمانہ گزر چکا تھا دس برس ہوئے کہ ایک منحوس شام اور سو بج غروب ہونے سے پہلے جتا تھن ہارکر، کوفی، ڈاکٹر سیورڈ اور آر تھر ٹائی چار لسنٹی انگریزوں نے کلیو کے آقا، کونٹ ڈریکولا کا خاتمہ کر ڈالا تھا، اور اس منحوس شام کے بعد حالات کا رخ بدل گیا تھا۔ کیوں کہ اب کونٹ ڈریکولا نہ رہا۔

تاہم اس کی ہیبت وادی کے لوگوں کے دلوں پر اب بھی طاری تھی چنانچہ لوگوں کا

سجدہ کر رہے ہوں یا جیسے کسی دیو نے دوسری طرف سے ان پر ہونک دیا ہو۔

لیکن قصر کے کمرے میں کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے مسافروں نے ان باتوں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ایلن اور ڈائنا نے قدرے شش و پنج کے بعد اپنا اپنا جام اٹھایا۔

”کونٹ ڈریکولا۔“ ڈائنا نے اپنا جام بلند کر کے کہا اور اس کی آواز کھوں کی وسعتوں میں گھوم گئی۔

اور فوراً ہی قصر کا پراسرار ملازم جس نے اپنا نام کلیو بتایا تھا قصر کی اندرونی اور انجانائی گزر گاہوں میں سے نکل آیا۔ کسی نے اسے آتے نہ دیکھا۔ اور کسی نے اسے آتے نہ سنا۔ وہ خاموشی سے آیا اور میز پر سے سوپ کی قاقبیں اٹھا اٹھا کر پشتی میں رکھنے لگا۔ لیکن اتنی مہارت سے کہ چینی کے برتنوں کی بھی ٹکٹنا ہٹ پیدا نہ ہوئی۔ کلیو کا چہرہ پتھر کے بت کے چہرے کی طرح ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا کلیو نے مہمانوں کی طرف دیکھا۔ چارلس، ایلن اور ڈائنا اپنے اپنے جام میز پر رکھ چکے تھے۔

”کونٹ ڈریکولا۔“ ایلن نے سر ہلا کر کہا۔

لیکن کلیو کی نگاہیں۔ ہیلن کے جام پر مرکوز تھیں اس کا جام میز پر ہی دھرا ہوا تھا اور بدستور لبریز تھا اس نے دوسروں کے ساتھ نہ تو جام اٹھایا اور نہ ہی کونٹ ڈریکولا کے نام کا جام پیا تھا۔

ذہب پہنچ گئے تھے ایک انگریز نے جس کا نام جتا تھن تھا۔ چکڑے پر چڑھ کر تابوت
نیچے لٹکا دیا تھا اور ان لوگوں نے تابوت کا ڈھکن کھول کر ایک طرف پھینک دیا تھا
اور اس تابوت میں کلیو کا آقا ڈرکولا دراز تھا۔ اسی انگریز نے جس کا نام جتا تھن تھا اپنا
ہاتھ نکال کر ڈرکولا کے حلق میں اتار دیا تھا۔ اور پھر اسے گھسیٹ کر وہ ظالم ڈرکولا کو
بیچ کر لے گیا تھا اور دوسرے انگریز کا چاقو اس وقت ڈرکولا کے سینے میں اتر گیا تھا اور
جب کونٹ ڈرکولا کا جسم ریزہ ریزہ ہو رہا تھا اس وقت کلیو نے جو ان خانہ بدوشوں کے
ساتھ تھا، اپنے دل میں کونٹ کے یہ الفاظ سنے تھے کہ:

”ایک وقت آئے گا، کلیو“ جب میں دوبارہ اٹھوں گا ایک بار پھر میری حکومت
ہوگی اور ایک بار پھر میرا دور دورہ ہوگا۔ ایک بار پھر لوگ میرا نام سن کر لرزے اور
کاپٹے لگیں گے، تم میرا قعر آباد رکھو، اس وقت کا انتظار کرو وہ ضرور آئیگا اور جب وہ
وقت آئے گا تو میری ان ہدایتوں پر عمل کرنا۔“

اور تب کلیو نے اپنے دل میں چند عینی سنی تھیں اور اس دن سے لے کر اب
تک وہ اس وقت کا منتظر رہا تھا۔ جس کا وعدہ اس کے آقا نے کیا تھا۔ اور وہ بے حد
طویل اور صبر آزما انتظار تھا یہ۔

لیکن اب وہ وقت آگیا تھا۔ آج کی رات تمام باتیں ایسی ہی ہوئی تھیں جیسی کہ
کونٹ نے کہا تھا۔ کئی برسوں سے کوئی اس قعر کے قریب تک نہ آیا تھا۔ لیکن آج
رات چار انسان نہ صرف یہاں آئے تھے بلکہ قعر کی موٹی موٹی دیواروں کے اندر تھے
اور پھنس گئے تھے۔ لیکن انہیں پتہ نہ تھا کہ وہ کس جال میں پھنس گئے تھے۔ انہیں
معلوم نہ تھا کہ کیا ہونے والا تھا۔ انہیں ذرا بھی شک نہ ہوا تھا۔ کیوں کہ ان چاروں
مٹا سے کسی ایک نے بھی فرار ہونے کی کوشش اب تک تو نہ کی تھی۔ وہ یہیں تھے
اکی قعر میں تھے اور وہ وقت آگیا تھا جس کا انتظار نہ صرف کلیو کو بلکہ کونٹ ڈرکولا کو

یہ حال تھا کہ جب کبھی کلیو کالے گھوڑوں والی بگھی میں سوار ہو کر بستی میں جاتا تو اس
کے سامنے احرام سے جھک جاتے تھے یا پھر خوف سے سٹ کر ادھر ادھر ہٹ جاتے
تھے یا دبک جاتے تھے، لیکن کلیو اب زیادہ باہر نہ جاتا تھا کیونکہ اسے احساس تھا کہ
لوگوں کے دلوں سے ڈرکولا کا خوف رفتہ رفتہ دور ہو چلا تھا۔ اور اب خود کلیو کے لئے
یہ خیال سوہان روح بنا ہوا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں کے دلوں سے اس کے آقا
ڈرکولا کا خوف بالکل ہی جاتا رہے اور وہ کلیو پر حملہ کرنے کی ہمت کر بیٹھیں اگر ایسا
ہو تو پھر اسے کوئی نہ بچا سکے گا۔ کیونکہ اب اس کا آقا نہ رہا تھا، ظلمت کا وہ دیوتا مٹی
بن چکا تھا جس کے نام سے ایک عالم لرز رہا تھا، اگر ایسا ہوا کہ لوگوں نے کلیو کو قتل کر
دیا تو پھر یقیناً وہ لوگ قعر ڈرکولا پر بلہ بول دیں گے اور انہیں روکنے والا کوئی نہ
ہوگا۔۔۔۔۔ لیکن شکر ہے کہ لوگوں کو اب تک یہ احساس نہ ہوا تھا۔ چنانچہ ٹھیک ہی تھا
کہ وہ پرانا شدید خوف اب تک ان کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ یہ ٹھیک ہی تھا کہ وہ
اب تک پرانی باتیں نہ بھولے تھے اور نہ بھولے تھے کہ چاندنی راتوں میں سیمیں
ذرات قہقہے لگاتی ہوئی چڑیلوں میں تبدیل ہو جاتے تھے اور نہ یہ بھولے تھے کہ رات
کے اندھیرے میں کئی قبریں اپنے دہانے کھول دیتی تھیں اور ان میں سے ڈرکولا کی
دہائیں نکل آتی تھیں۔ ہاں۔ وہ لوگ یہ باتیں نہ بھولے تھے چنانچہ وہ اب بھی قعر کی
طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ڈرتے تھے۔ اور اب بھی ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ کرتے تھے۔
اور کلیو اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جو آنے والا تھا۔ کیونکہ اس کے آقا نے کہا
تھا کہ وہ وقت آئے گا، اور ضرور آئے گا۔ کلیو کو یاد تھا کہ اس منحوس شام کو جب
خانہ بدوشوں کا ایک گروہ ایک چکڑے میں تابوت لادے قعر کی طرف لا رہا تھا، تو کیا
ہوا تھا۔ اسے یاد تھا کہ چار انگریز اس چکڑے کا تعاقب کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے
جالیا تھا اور پھر وہ خانہ بدوشوں سے لڑتے بھڑتے اور ان کا حلقہ توڑ کر چکڑے کے

ہٹایا۔ کچھ جاگتے میں اور کچھ سوتے میں کوئی سول پوچھا گیا اور پھر کوئی پوری طرح بیدار ہو گیا۔

ایک عورت کی آواز نے پوچھا۔

ایلیں! اٹھو کیا تھا وہ؟

مہوں۔ اوں۔ کیا بات ہے؟

ایلیں! اٹھو بھی۔ کسی نے میرا نام لے کر پکارا تھا۔

سارے نہیں۔ خواب دیکھا ہو گا۔ سو جاؤ۔

ایلیں! خدا کے لئے اٹھو۔

یعنی یہ کیا حماقت ہے کہ۔۔۔۔۔

سچ کتنی ہوں، کسی نے مجھے پکارا تھا۔

پکارا ہو گا۔ سو جاؤ اب۔ چپ۔

نہیں۔ خدا کے لئے اٹھو اور جا کر دیکھو باہر۔۔۔۔۔

یہ عجیب مذاق ہے بھی۔

لیکن نہیں۔ یہ مذاق نہ تھا۔ گزرگاہ میں سے کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی، یہ کلیو تھا جو بڑی تیزی سے چلتا ہوا گزرگاہ کے انتہائی سرے پر پہنچ گیا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے پورا قعر دفعتاً بیدار ہو گیا ہو۔ لیکن یہ لوگ اس کے حلقے کیا جانتے تھے یا جان سکتے تھے؟ ہاں یہی بے وقوف لوگ جو آج رات قعر میں بے سکون اور اطمینان سے سو رہے تھے؟ ڈرکولا کا نام ان کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا قعر ان کے لئے ایک ہوٹل کی طرح تھا جہاں انہیں رات گزارنے کے لئے کمرے مل گئے تھے۔۔۔۔۔ قعر کے زندہ مردہ مالک کے وجود سے یہ لوگ بے خبر تھے اور کلیو اسی قعر کے زندہ مردہ مالک کا ملازم تھا۔ اور اس پر اسے فخر تھا۔

بھی تھا۔ کونٹ انہی مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں آج رات کونٹ ڈرکولا کی پیاس بجھائی جائے گی۔ اور پھر وہ ہو گا۔ جو کسی کے وہ گمان میں بھی نہ تھا۔

نیچے وادی میں بھڑیئے چلا رہے تھے۔ بھڑیئے، جنہیں کونٹ ڈرکولا نے پہلے شب کہا تھا۔ جن کی آواز اسے بہت پسند تھی اور جو اس کے تابع فرمان تھے، یہ بھڑیئے خوشی سے چلا رہے تھے کیونکہ آج ہی رات کو وہ معجزہ ہونے والا تھا۔ کا وعدہ ظلمت کے دیوتا نے کیا تھا۔

اور قعر کی ایک گزرگاہ میں کلیو ٹھل رہا تھا اور ماضی کی تصویریں یکے بعد دیگرے نظر کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ ماضی۔۔۔۔۔ جو اب مستقبل بن جائے گا ماضی! تھا، حال برا رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کا آقا مجسم ہو گا وہ پھر سینہ گیتی پر چلتا پھرتا آئے گا۔ اس قعر میں ایک بار پھر اس کی فراہٹ اور اس کی دہنوں کے قہقہے گونجیں گے۔ پھر وہی خون اور ظلمت کا دور شروع ہو گا۔ خون۔۔۔۔۔ جو اس کے آقا کی نافرمانی اور ظلمت۔۔۔۔۔ جس کا دیوتا ہے اس کا آقا۔ بھڑیوں کی چیخوں سے اور چگاڑوں کی پھڑپھڑاہٹ سے یہ وادی پھر آباد ہوگی۔ کیونکہ اب وہ وقت آگیا تھا۔ کلیو ٹھلتے ٹھلتے دیوار کے حلقے میں اٹھی ہوئی ایک مشعل کے قریب رک گیا۔

ایلیں! اس نے آہستہ سے کہا۔

کچھ دیر تک وہ اسی جگہ کھڑا رہا، پھر وہ آگے بڑھا اور اب وہ ایک بند دروازے کے قریب کھڑا تھا۔

ایلیں! اس نے ایک بار پھر کہا۔

اور فوراً ہی بند دروازے کے پیچھے والے کمرے میں سے سرسراہٹ کی ہلکی آواز سنائی دی، کسی نے بستر پر کھوٹ بدلی تھی، ایک جہانی لی گئی، کوئی نیند میں کچھ

ہے ہی لوٹ نہ جائے۔ ہاں کلیو یہ نہ چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ چند ٹائیوں تک جہاں تھا وہیں کمرہ انتظار کرتا رہا، یہاں تک کہ اسے یقین ہو گیا کہ الین اب اس کے بست قریب پہنچ گیا تھا اور اب اس نے دیوار پر لٹکے ہوئے ایک پردے کو ہٹایا اور صندوق کو ایک جھلکے کے ساتھ اس کے پیچھے کھسٹ لیا۔ پردے کے پیچھے دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ اس نے وہ دروازہ کھول کر اور اپنا دوسرا ہاتھ بدھا کر اس نے پردے کو ایک آخری جھٹکا دیا، تاکہ وہ اس وقت تک ہلتا رہے جب تک کہ وہ سادہ لوح اور احمق انگریز اس کے قریب نہیں پہنچ جاتا، جو اس کا تعاقب کر رہا تھا اور جس کے لئے ایک خاص قسم کا انجام مقدر ہو چکا تھا۔

الین جو اس کا تعاقب کر رہا تھا، یقیناً زرا احمق تھا لیکن ایسا احمق جس کی رگوں میں مادہ حیات گردش کر رہا تھا۔ ایک انسان جس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ لیکن جو ذی روح تھا، جس کے جسم میں حیات بجھنے کے ضروری اور اہم اجزاء تھے۔ اور اب وہ وقت قریب تھا۔ بست قریب تھا۔

پردے کے پیچھے دروازہ اور دروازہ کے پیچھے ایک چکر دار زینہ تھا اور کلیو اس صندوق کو اسی زینہ پر سے نیچے لئے جا رہا تھا۔

نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔ یہاں تک کہ وہ سطح زمین پر پہنچ گیا لیکن وہ نہ رکا۔ وہ زینہ اترتا رہا۔ اس بیش بہا صندوق کو سنبھالے زینہ اترتا ہی رہا اور آخر کار تہ خانے میں پہنچ گیا۔ کلیو سے کہا گیا تھا کہ اسی تہ خانہ میں وہ معجزہ ہوگا۔ دشمنوں نے جب یقین کر لیا تھا کہ اب ظلمت کے دیوتا کا خاتمہ ہو گیا تو اس وقت کونٹ ڈریکولا نے کلیو کے دل میں کہا تھا کہ اس ظاہری خاتمہ کے بعد اس کی۔۔۔ کونٹ ڈریکولا کی حیات نو کا آغاز ٹھیک اسی تہ خانہ میں ہوگا۔ اسی تہ خانہ میں شکست فتح میں تبدیل ہوگی۔ اسی جگہ سے کونٹ ڈریکولا کا ظہور ثانی ہوگا اور اسی جگہ بے نور آنکھوں کو

”پہاؤں۔“ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور کلیو جلدی سے کچھے ہٹ کر چھپ کر الین دروازہ کھول کر باہر گزر گاہ میں آگیا اس نے اپنے ایک ہاتھ میں موم بنی اٹھارہ تھی اور وہ خود مسلسل بجائیاں لے رہا تھا۔

وہ بڑا سائیکل اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ سال سے وہ اسی جگہ دھرا ہوا تھا اور وہ بھی گویا اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا یہ ٹرنک ایک غیر معمولی طور پر بڑا سبز صندوق معلوم ہوتا تھا جس میں کانٹس کے قلابے اور تالے لگے ہوئے تھے۔ بظاہر اس میں کوئی خاص بات نہ تھی لیکن کلیو جانتا تھا کہ اس صندوق میں کون سا خزانہ بند ہے صرف وہ جانتا تھا کہ اگر حالات اس کے موافق ہوئے اور قسمت نے ساتھ دیا تو ہوگا۔۔۔ اگر ڈریکولا کی ہدایتوں پر صحیح طور سے عمل کیا گیا۔۔۔ اگر صندوق کا ڈمکر کھولا گیا اور وہ الفاظ کہے گئے۔ اور حیات بخش سیال پیش کیا گیا تو کیا ہوگا۔۔۔ اس سے صرف کلیو واقف تھا۔۔۔ مٹی جسم بن جائے گی۔ عدم وجود میں تبدیل ہو جائے گا۔ اور حقیر اور بے معرف زندگی عظیم بن جائے گی۔ کلیو نے صندوق کا ایک حلقہ پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا گزر گاہ کے آخری سرے تک لے آیا۔ پیچھے سے گزر گاہ میں سے بیروں کی چاپ سنائی دے رہی تھی جو اسی طرف بڑھ رہی تھی۔۔۔ آہستہ آہستہ اور احتیاط سے لیکن کلیو نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ الین نے اسے صندوق کھینٹ کر اس طرف لاتے دیکھ لیا تھا۔ اور اب وہ شوق تجسس سے بیتاب ہو کر اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ لیکن کلیو خوفزدہ نہیں بلکہ مطمئن اور خوش تھا کیوں کہ وہ یہی چاہتا تھا۔

اپنے قیمتی بوجھ کی وجہ سے کلیو پسینہ پسینہ ہو رہا تھا لیکن اس نے شکایت نہ کی۔ اس کی رفتار دھیمی ہو گئی اور یہ صندوق کا بوجھ نہ تھا۔ جس نے کلیو کی رفتار کم کر دیا تھی، نہیں، بلکہ اس نے قصداً ایسا کیا تھا کہ وہ جو اس کا تعاقب کر رہا تھا، راستہ میں

اس صندوق میں اور سوچنے دو، الجھے دو کیونکہ بہت جلد وہ تمام محسوسات سے عاری ہو جائے گا کچھ ہی دیر بعد وہ کچھ نہ محسوس کر سکے گا، کچھ نہ سوچ سکے گا۔

مندوق کے پیچھے دیوار پر ایک عمدہ ریشمی لبادہ لٹک رہا تھا یہ لبادہ کالا تھا۔ جس پر سرخ و حاریاں تھیں۔ ایلن نے اس لبادے کی طرف دیکھا تاکہ نہیں کیوں کہ اس کے نزدیک اس لبادے کی کوئی اہمیت نہ تھی وہ جانتا ہی نہ تھا کہ یہ لبادہ قصر کے مالک کوٹ ڈریگولا کا تھا۔

کلیو کے نزدیک ایلن بیوقوف تھا اور سمیٹ چڑھانے کے قابل نہ تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ زندہ رہنے کے قابل بھی نہ تھا۔

موم بتی کا شعلہ ذرا سا کانپ کر دھواں اٹھنے لگا اور پھر بے حرکت اور سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس کی روشنی اس کتبے پر پڑی جو تابوت کی لوح پر کندہ تھا۔
الین جھک کر اسے دیکھنے لگا۔

خود کلیو نے بڑی محبت سے، بڑے احرام سے، بڑی مشقت سے اور آہستہ آہستہ اپنی احتیاط سے اس کتبے کے X حروف کندہ کئے تھے اپنے آقا کے وعدوں کے باوجود اس نے یہ حروف اس چوکی پر کندہ کر دیئے تھے۔ کیوں کہ کلیو نے اپنا آخری فرض سمجھتا تھا اور اس کے ذریعہ وہ اپنی وفاداری کا اظہار بھی کرنا چاہتا تھا اور اب وہ بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ اسے دوسرے بھی فرائض ادا کرنے تھے۔ کیوں کہ اس کا وقت آگیا تھا۔

اپنی آنکھیں بند کر کے بھی وہ ان حروف کو صاف طور سے دیکھ سکتا تھا جو تابت کی چوکی پر کندہ تھے اور جنہیں ایلن موم بتی کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔ اور یہ حروف ایک خطاب اور ایک نام بناتے تھے "کونٹ ڈریگولا"۔

نہ تو مرنے کی کوئی تاریخ لکھی ہوئی تھی، نہ دنیا کی بے ثباتی ظاہر کرنے کے لئے

بینائی بخشی جائے گی اور اسی جگہ پیاس مٹائی جائے گی۔

ہاں اگر ہذا تہوں پر عمل کیا گیا۔ اگر شرط پورے کئے گئے۔

اس یہ قوف نے جس کا نام ایلن تھا دروازہ تلاش کر لیا تھا جو پتھر کے پیچھے تھا۔ چنانچہ اب وہ بڑی احتیاط سے چکروار زینہ اتر رہا تھا۔ وہ تہ خانہ میں آگیا۔ اس کے بچوں نے تہ خانے کے فرش کو چھوا۔ تو کسی کو نے میں ایک چمکدار پھڑپھڑا کر دیک گیا اور موم بتی کا، جو ایلن کے ہاتھ میں تھی، شعلہ سمٹ کر لمحہ بھر کے لئے موم بتی کی سلاخ میں دبک سا گیا لیکن پھر فوراً ہی ابھر آیا۔ اور اس کی زرد مودہ سی روشنی کے سائے تہ خانے کی سفید دیواروں پر رقص کرنے لگے۔

کلیو ایک طرف دب گیا۔ رسم کا پہلا مرحلہ اطمینان بخش طور پر ادا ہو چکا تھا۔ تنہ خانے کے عین بیچ میں ایک شاندار چوکی پر پتھر کا ایک مرصع تابوت رکھا ہوا تھا اور اندھیرے میں کلیو کے قریب جو مرتبان نمابٹنی کا ظروف تھا جو اس نے اس کالے صندوق سے نکال کر اپنے قریب رکھ لیا تھا۔ اور مرتبان میں وہ چیز تھی جو کلیو کو دنیا کی کسی بھی چیز سے زیادہ عزیز تھی وہ بیش بہا خزانہ جس کی حفاظت وہ دس سال سے کرنا آیا تھا..... راکھ جو اب بھی ملکیت تھی۔ وہ خاک جو، اب بھی گوشت و پوست میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

بشرطیکہ ہدایتوں پر پورا پورا عمل ہوا۔

ایلین تہہ خانے میں اتر آیا۔ موسمِ بقی کی روشنی اس صندوق پر پڑی جسے کلیو نے ایک کونے میں رکھ دیا تھا۔ صندوق میں سے مرتبان نکالنے کے بعد کلیو نے اس کا ڈھکن کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کچھ تو اس لئے کہ ایلین قریب آیا تھا۔ اور ڈھکن بند کرنے کا موقع نہ تھا۔ اور کچھ اس لئے کہ اب اس صندوق میں کچھ نہ تھا۔ اگر ایلین نے جھانک کر اس صندوق میں دیکھا بھی تو وہ اسے خالی پائے گا۔ چنانچہ اس کو دیکھنے دو

کلیو آہستہ سے اپنی کمین گاہ سے نکل آیا۔ وہ بڑے اطمینان اور سکون سے ایلن کی طرف بڑھا۔ جلدی مچانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس رسم کی ادائیگی میں کسی اصول کی پابندی کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی اسے شان اور تمکنت سے ادا کرنا تھا لیکن چونکہ وہ اپنے آقا کی ایک زبردست خدمت انجام دے رہا تھا اس لئے وہ بڑی شائستگی اور احترام سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ کسی قسم کی بھی آواز پیدا کئے بغیر طاق کے قریب پہنچ گیا اور ایک ہاتھ بڑھا کر کمبل کے پردے کا ایک کونا پکڑ لیا۔ ایلن چونک کر ایک دم سے اس کی طرف گھوم گیا۔

کلیو کے بشرے سے کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہ ہو رہا تھا۔ جیسے وہ پتھر کے بت کا چہرہ ہو۔ اس نے بڑے اطمینان سے اپنا بڑا سا چاقو نکال لیا اب بھی وہ پرسکون تھا۔ خود اسے احساس تھا کہ اس کی کسی بھی حرکت سے عجلت اور گھبراہٹ ظاہر نہ تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اس کی ایک ایک حرکت بر محل تھی۔ حتیٰ کہ اس کی پھرتی میں بھی ایک عجیب رکھ رکھاؤ تھا ایک عجیب شان تھی چنانچہ جس پھرتی اس نے اپنا چاقو نکالا تھا وہ بھی خود کلیو کو ایک بڑی حسین اور قابل تعریف حرکت معلوم ہوئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خود کونٹ ڈرکولا اس کے قریب کھڑا اپنی ٹھہری ہوئی مگر گو بھدار آواز میں اسے ہدایتیں دے رہا ہو تاکہ معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔

کلیو کا چاقو والا ہاتھ تیزی سے بلند ہوا اور دگنی تیزی سے جھکا۔ چاقو کا تیز پھل ایلن کے بدن میں اس طرح آسانی سے اتر گیا جیسے یہ انسان گوندھے ہوئے آلے کا بنا ہوا ہو۔ ایلن نے اپنا منہ کھولا۔ شاید چیخنے کے لئے یا شاید کچھ کہنے کے لئے لیکن اس کے حلق سے جو دہی ہوئی اور گٹھی ہوئی آواز نکلی اس کا کوئی مطلب نہ تھا۔

ایلن لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور اس کی پیٹھ دیوار سے لگ گئی۔ کلیو نے بڑے اطمینان سے لڑکھڑاتی سے اس کے جسم میں سے چاقو گھسیٹ لیا، اس کا ہاتھ پھر بلند ہو کر جھکا اور

کوئی شعر کندہ کیا گیا تھا اور نہ ہی اس کے متعلق کوئی فرسودہ عبارت تحریر تھی کہ کونز قیامت تک سکون سے سوتا رہے گا کیوں کہ کونٹ ڈرکولا کبھی نہ سویا تھا اور نہ سوئے گا۔ وہ کبھی سکون سے نہ سوئے گا۔ سکون اسے میرا ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ سکون تو بندلوں کے لئے ہوتا ہے، وہی اس کی آرزو کرتے ہیں اور جب بیوقوفوں کا وقت آتا ہے تو شاید انہیں بھی قیامت تک سکون کی نیند بخشی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ انہیں ملتا ہی کیا ہے؟ ایلن سیدھا کھڑا ہو گیا وہ ایک بار پھر تہ خانے کا جائزہ لے رہا تھا۔

اور تہ خانے کے اندر میرے کونے میں کھڑا کلیو اسے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی شکاری نظروں نے تہ خانے کی دیوار میں وہ جگہ تلاش کر لی جس میں کلیو سویا کرتا تھا۔ ایک طویل طاق سا تھا۔ پورا قعر خالی تھا۔ اس میں بہت سی خواب گاہیں تھیں اور پھر قعر کا کوئی آقا نہ تھا، کوئی مالک نہ تھا چنانچہ کلیو جہاں چاہتا سو سکتا تھا۔ وہ خود اس قعر کا گویا مالک تھا۔ لیکن کلیو نے قعر کی آرام دہ خواب گاہوں سے کبھی فائدہ نہ اٹھایا تھا۔ اس نے اپنے اسی پرانے کھدوے پتنگ پر سوتا پسند کیا تھا۔ جو اس تہ خانے کی دیوار میں پھری سل جڑ کر بنایا گیا تھا۔ اپنے آقا سے یہ اس کی محبت ہی تھی جو اسے یہاں تہ خانے میں اور اپنے آقا کی قبر کے پاس سونے پر مجبور کیا کرتی تھی لیکن یہ بات بھی صرف کلیو ہی جانتا تھا کہ کونٹ ڈرکولا کی قبر خالی تھی۔ اس میں کچھ نہ تھا۔ نہ کوئی لاش اور نہ مٹی۔

ایلن نے وہ کمبل ہٹایا جو پردے کا کلام کر رہا تھا اس کے پیچھے دیوار میں ایک طویل طاق سا بنا ہوا تھا، اس طاق میں پھری ایک لمبی سل جڑی ہوئی تھی اور اس پر ایک پٹھا پرانا بستر بچھا ہوا تھا۔

وحشت زدہ ایلن پٹی پٹی آنکھوں سے بستر کی طرف دیکھنے لگا۔

کلیو مسکرایا۔ یہ انگریز بے وقوف ضرور تھا لیکن خون سے بھرپور تھا۔ کلیو نے چاقو پھینک کر ایلین کے گرتے ہوئے جسم کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اور اب اسے بڑی تیزی اور پھرتی سے کام کرنا تھا۔ ایلین کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اب وہ زندہ انسان نہ تھا۔ وہ ایک لاش تھا۔ وہ لاش کو تابوت کے قریب گھسیٹ لایا اور اسے تابوت کی چوکی سے نیک لگا کر بٹھا دیا تاکہ اس کا خون بہہ نہ جائے۔ اس طرف سے اطمینان کر کے وہ پھر تہ خانے کی دیوار کے قریب پہنچا اور وہ رسہ کھول لیا جو ایک ستون کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ کلیو اور اس کالے صندوق کی طرح یہ رسہ بھی جیسے اس وقت اور اس گہری کا انتظار کر رہا تھا۔

انتظار..... طویل انتظار..... ہر چیز ختم تھی۔ دس برس سے ہر چیز تیار تھی لیکن کوئی اس جال میں نہ پھنسا تھا۔ لیکن اب چار انجانے شخص اس جال کے کنارے تک آگئے تھے۔ اور ان میں سے ایک شخص آخری قدم اٹھا کر اپنی منزل تک پہنچ چکا تھا۔ اب تین باقی رہ گئے تھے۔

کلیو اب بڑی پھرتی کا تبوت دے رہا تھا کیونکہ اب ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اس نے رسے کا ایک سرا ایلین کی لاش کی ٹانگوں کے گرد لپیٹ کر مضبوط گرہ لگا دی۔ اس طرف سے فرصت پا کر وہ پھر ستون کے قریب پہنچا، اپنی ٹانگیں پھیلا کر اور نیچے تہ خانے کے فرش پر جتا کر کھڑا ہو گیا۔ اور اب اس نے دونوں ہاتھوں سے رسے کا دوسرا سرا پکڑا

چاقو ایک بار پھر ایلین کے جسم میں تیر گیا۔ اور اب کلیو نے چاقو گھسیٹ کر اپنے ہاتھ میں سیدھا پکڑ لیا جس طرح قصاب قربانی کے بکرے کو ذبح کرنے کے لئے سیدھا پکڑ لیتا ہے۔ اور پھر اس نے چاقو کی تیز دھار ایلین کے حلق پر پھیر دی۔ اس کے حلق پر اس سرے سے اس سرے تک ایک سرخی لکیری نمودار ہو گئی۔ کلیو نے اطمینان کا سانس لے کر دیکھا کہ ایلین کے حلق پر کی سرخی لکیر آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔



کلیو دوڑ کر وہ مرتبان اٹھا لیا جو اس نے کالے صندوق میں سے نکالا تھا، بڑے احرام کا اظہار کرتے ہوئے اس نے مرتبان کا ڈھکن کھولا۔ ڈھکن کھل چکا تو اس نے مرتبان کا منہ تابوت کی دیوار کے کنارے سے لٹکا دیا اور آہستہ آہستہ اسے جھکانے لگا۔ بھورے رنگ کی مہین راکھ مرتبان میں سے تابوت کے پینڈے میں گرنے لگی۔ کلیو نے مرتبان کو درمیان میں سے دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور اسے تابوت کی دیوار کے کنارے پر آہستہ سے ادھر ادھر کھینچنے لگا۔ راکھ تابوت کے پورے پینڈے میں ہانسنی سے سرہانے تک بکھر گئی۔ راکھ کی سطح ہموار ہونی چاہیے۔ کسی جگہ اس کی زمیری نہ ہو اور کوئی جگہ خالی بھی نہ ہو ورنہ وہ نہ ہو گا جو ہونا تھا۔ اور کلیو نے دیکھا کہ یہ شرط پوری ہو گئی تھی۔ راکھ کی سطح بالکل ہموار تھی اور وہ تابوت کے پورے پینڈے میں بکھری ہوئی تھی۔

مرتبان خالی ہو گیا تو ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ یہ مرتبان اب خالی تھا چنانچہ اب اس کا احترام بھی لازم نہ تھا۔ یہ اب ایک حقیر خالی برتن تھا جس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ بیٹن ہا چیز اس تابوت کے پینڈے میں بکھری ہوئی تھی۔ اس نے مرتبان ایک طرف پھینک کر ایک بار پھر اپنا چاقو اٹھالیا۔

دوسرے ہاتھ سے اس نے ایلن کی لاش کے بال پکڑ لئے کہ وہ جھولنے نہ پائے۔ ایک بار پھر اس نے چاقو کی تیز دھار لاش کے حلق کے شکاف پر رکھ دی اور تیزی سے چاقو چلانے لگا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ لاش کے بال پکڑے ہوئے تھا۔ اور سر کو اپنی پوری قوت سے نیچے کھینچ رہا تھا۔

چاقو اپنا کام بڑی تیزی سے کر رہا تھا چنانچہ جلد ہی ایلن کا سر تن سے جدا ہو گیا اور اب وہ کلیو کے دوسرے ہاتھ میں لٹک رہا تھا۔

سرخ خون کی دھاریں تابوت میں گرنے لگیں۔ کلیو نے ایلن کا سر ایک طرف

اور اسے کھینچنے لگا۔

ایلن کی لاش آہستہ آہستہ نیچے سے اٹھنے لگی۔ اس کی ٹانگیں اوپر تھیں اور سر نیچے۔ کلیو رسہ کا سرا کھینچتا ہی رہا اور لاش اوپر اٹھتی رہی یہاں تک کہ وہ فرش سے پوری طرح اٹھ گئی۔ اب کلیو اس کا بوجھ محسوس کر رہا تھا اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ لیکن وہ رسہ برابر کھینچنے جا رہا تھا۔ لاش اوپر اٹھ گئی وہ فرش سے کئی فٹ اوپر الٹی لٹک رہی تھی۔ کلیو کوشش کر کے اسے اس کے ٹھیک مقام پر لے آیا۔ لاش اب ٹھیک تابوت کے عین اوپر لٹک رہی تھی ٹانگیں اوپر اور سر نیچے۔ کلیو نے رسے کا دوسرا سرا ستون کے گرد لپیٹ کر وہاں بھی مضبوط گرہ لگا دی۔

لاش کے زخموں میں سے جیتا جیتا خون تابوت کے ڈھکن پر ٹپک رہا تھا۔ کلیو تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی استخوانی انگلیاں تابوت کی دیوار اور ڈھکن کی درمیانی دراڑ میں داخل کر دیں۔ اس نے کمر جھکا کر دانت پس کر اور ہونٹ بھیج کر زور لگایا لیکن ڈھکن کو ایک انچ سے زیادہ اوپر نہ اٹھا سکا۔ اس نے پھر کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا ڈھکن بے حد وزنی تھا اور اسے اٹھانے کے لئے کلیو کو اپنے جسم کی پوری وقت صرف کرنا تھی۔ چنانچہ اب اس نے ڈھکن کے باہر کو لٹکے ہوئے کنارے کے نیچے اپنا ایک کندھا لگایا اور اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر جما کر جو زور لگایا تو تابوت کا ڈھکن اوپر اٹھ گیا۔ کلیو نے اور زور لگایا۔ ڈھکن اوپر اٹھا اور تابوت کے کنارے پر سے پھسل کر تابوت کے دوسری طرف بڑی آواز کے ساتھ فرش پر جا پڑا۔

تابوت میں کچھ نہ تھا۔ اور خالی تابوت کے عین اوپر رسے سے بندھی ہوئی ایلن کی لاش الٹی لٹک رہی تھی۔ چونکہ وہ ہوا میں بلند تھی اس لئے ہولے ہولے گھوم رہی تھی۔

پھینک دیا۔

تابوت کے کناروں پر فوراً ہی بھورے رنگ کی ہلکی سی دھند نمودار ہو گئی اس دھند کو دیکھتے ہی کلیو کے دل میں خوف اتر آیا لیکن پھر جو کچھ ہونے والا تھا اس کا خیال اس کے خوف پر غالب آگیا اور اب وہ فرط انبساط سے کانپ رہا تھا۔ آخر کار اس کی محنت ٹھکانے لگ رہی تھی۔ انتظار کا طویل دور آخر کار ختم ہو رہا تھا۔

اب تک ان کے دل سے شک دور نہ ہوا تھا۔ حالانکہ اس کے آقا نے کہا تھا کہ اگر ہدایتوں پر عمل کیا گیا تو یہ ہو کر رہے گا۔ تاہم کلیو کو اس پر پوری طرح یقین نہ تھا لیکن اب اسے یقین ہو گیا تھا۔ حیات بخش خون تابوت میں ٹپک رہا تھا اور تابوت میں سے بھورے رنگ کی دھند اٹھ رہی تھی، گاڑھی ہو رہی تھی اور پھیل رہی تھی۔

کلیو گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اس کا آقا نیا جنم لے رہا تھا۔

دھند اور بھی گاڑھی ہو گئی، وہ مختلف مرغولوں میں تقسیم ہو گئی تہہ خانے میں ہوا کے جھونکے ظاہر ہے کہ نہ آسکتے تھے۔ اس کے باوجود دھند کے مرغولے تابوت میں سے نکل کر تہہ خانے میں بکھر گئے۔ جیسے ہوا انہیں گھسیٹ رہی ہو۔

لیکن دھند کا ایک موٹا سا مرغولہ تابوت میں ہی چکر کاٹتا رہا اور پھر پھیل کر تابوت کے پینڈے میں بکھری ہوئی مٹی پر پھیل گیا۔ پائنٹی سے سرہانے تک۔

اور وہ ہونے لگا جس کا وعدہ کونٹ ڈریکولا نے کیا تھا۔

تابوت کے پینڈے میں بہت سی سرخ اور نیلی رگیں پیدا ہو گئیں وہاں رگوں کا جال سا بچھ گیا اور پھر ان رگوں پر گوشت اور پتھروں کی تہ نمودار ہو گئی۔ فوراً ہی تابوت کے سرہانے ایک انسانی کھوپڑی کا خاکہ سا ابھرا۔ اس کھوپڑی میں آنکھیں نہ تھیں بلکہ دو گہرے سوراخ تھے اور اس کے ہونٹ بھی نہ تھے لیکن دانتوں کی قفا ضرور تھی اور ان میں وہ دو دانت، جنہیں کتا دانت کہتے ہیں۔ کیلیے اور تیز تھے

بھیڑیے کے دانتوں کی طرح اور پھر کھوپڑی میں دو آنکھیں پیدا ہو گئیں اور دانتوں کو پہلے ہونٹوں نے ڈھک لیا۔ ایک ہاتھ بنا۔۔۔۔۔ ابتدا میں یہ ہاتھ خشک شنی کی طرح پتلا اور کانچ کی طرح تھا۔

اور پھر وہ ہاتھ ٹھوس بن گیا۔ ہاتھ اوپر اٹھا، اس کی پتلی اور لابی انگلیوں نے تابوت کا کنارہ پکڑ لیا اور وہ آہستہ آہستہ اٹھنے لگا جو تابوت میں بن چکا تھا۔

کونٹ ڈریکولا دوسرا جنم لے چکا تھا۔ دس سال بعد ایک بار پھر وہ اپنے تابوت میں سے نکل رہا تھا۔ اس کی بے بسی اور بے چارگی کا دور ختم ہو چکا تھا۔

یکبارگی بجلی بڑے زور سے چمکی، گرمی اور دل دہلا دینے والی آواز افق تا افق لوہکتی چلی گئی، کہیں دور جنگل کے قلب میں بھیڑیے ایک آواز ہو کر چلانے لگے لیکن عناصر کے تصادم اور بھیڑیوں کی چیخ و پکار کا مطلب کسی کی بھی سمجھ میں نہ آیا۔

قصر ڈریکولا کے مہمان بے خبر پڑے سوتے رہے۔ انہیں پتا بھی نہ چلا کہ کیا ہو گیا تھا اور دنیا والے بھی اس بات سے بے خبر رہے کہ کونٹ ڈریکولا وہ عفریت جو راتوں کو اپنی قبر سے نکل کر لڑکیوں کا خون پی لیا کرتا تھا۔۔۔۔۔ پھر بیدار ہو چکا تھا۔

اور وہاں، قصر ڈریکولا کے تہہ خانوں میں گھٹنوں کے بل جھکا ہوا کلیو خوف و ہیبت کے جذبات سے بے قابو ہو کر ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ وہ جو تابوت میں بن چکا تھا تابوت میں سے نکل آیا تھا۔ لیکن کلیو سراٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔ اور اب جب اس جانی پہچانی گونجندہ آواز نے اسے ایک حکم دیا تو اس وقت بھی کلیو نے سر نہ اٹھایا تاہم اس نے یہ ضرور محسوس کر لیا کہ اس کا آقا اس وقت کمزور ہو رہا تھا۔ بے حد کمزور۔۔۔۔۔ یہ کمزوری اس کی آواز سے بھی عیاں تھی۔ اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی کیونکہ اس کا آقا ایک نہ دو، پورے دس سال سے پیاسا تھا اور دس سال بعد آج بیدار ہو رہا تھا۔

بہاؤں کی طرف دھیان نہ دیا اور گزر گاہ کے انتہائی سرے پر پہنچ گیا اور پردہ اٹھا کر دوسری طرف زینہ اترنے لگا۔ ہیلن اس کے پیچھے ہی زینہ اتر رہی تھی۔ وہ دونوں آگے پیچھے زینہ اترتے رہے۔ اور زینے کے قدموں میں پہنچ کر وہ رک گیا اور ہیلن کا نظار کرنے لگا۔

اور حواس باختہ ہیلن زینہ اتر کر اس کے قریب پہنچ گئی تو وہ اسے راستہ دینے کے لئے ایک طرف ہٹ گیا اور اپنے خون آلود ہاتھ سے تہہ خانے کی طرف اشارہ کر کے

”میں جا کر دوسروں کو بیدار کرتا ہوں۔“

ہیلن نے قدم آگے بڑھایا۔ اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ بس جیسے توئم کے عالم میں وہ آگے بڑھ گئی۔ کلیو زینے کے قدموں میں خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

اور وہاں تہہ خانے میں ہیلن کے شوہر کی لاش، جس کا سر غائب تھا الٹی لٹک رہی تھی۔ اس کے جسم کے اس حصے سے جو کبھی مردن تھی۔ خون اب بھی قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ ہیلن نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملیں اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ حقیقت تھی اسے وہ ایک خواب پریشاں ہی سمجھے ہوئے تھی اور اس کا خیال تھا کہ یہ بھیانک خواب کچھ ہی دیر بعد غائب ہو جائے گا۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ چنانچہ وہ آگے بڑھی اور قصداً پیر پٹخ کر آگے بڑھی کہ اگر وہ بڑھی ہو تو اس کی آنکھ کھل جائے اور یہ بھیانک خواب غائب ہو جائے گا۔

”اور پھر اسے احساس ہوا کہ کلیو اس کی حیرت اور اس کے خوف سے محفوظ رہا تھا۔ اور ہیلن کو یقین ہو گیا کہ یہ خواب نہ تھا۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ بے شک اس کھلے ہوئے تابوت پر اوندھی لٹکتی ہوئی بے سر کی لاش اس کے شوہر کی ہی تھی۔“

اس کو نجلد اور کمزور آواز نے کلیو کو وہ حکم دیا تو موخر الذکر نے صرف اثبات میں سر ہلادیا۔ کئی برسوں کے بعد جو کلیو کو کئی صدیاں معلوم ہوئی تھیں اسے ایک بار پھر حکم مل رہا تھا چنانچہ اس کی زبان لنگ ہو گئی تھی۔

وہ سر ہلا کر اٹھا لیکن اس نے نظریں نہ اٹھائیں۔ وہ ہر ہر قدم پر احتیاطاً ”کمر میں سے جھلکتا تہہ خانے کے زینے تک اٹنے کے قدموں چلتا ہوا پہنچ گیا اور پھر پلٹ کر بدستور سر جھکائے زینہ چڑھنے لگا۔ وہ اوپر پہنچ گیا اور گزر گاہ میں پہنچ کر وہ اس خواب گاہ کی طرف چلا جس کا دروازہ کھول کر ایلن ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی باہر آیا تھا۔

اس نے خواب گاہ کے بند دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اس کے دونوں ہاتھ اب بھی خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ ایلن کے خون میں لیکن دستک دینے کے فوراً بعد ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ پشت کے پیچھے چھپالئے۔

آہستہ سے دروازہ کھلا اور ہیلن اپنے عین سامنے اور اپنے اتنے قریب کلیو کو کھڑا دیکھ کر کانپ گئی۔ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔

”مادام!“ کلیو نے کہا۔ ”بد قسمتی سے ایک حادثہ ہو گیا ہے۔“

ہیلن خاموش رہی۔ وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”آپ کے شوہر.....“ کلیو نے پھر کہا۔

لیکن ہیلن پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی صورت دیکھتی رہی۔

”آپ کے شوہر کے ساتھ ایک منحوس حادثہ ہو گیا ہے مادام۔ آپ فوراً تشریف

لائیے“ کلیو نے کہا۔

اور وہ پلٹ کر جس طرف سے آیا تھا اسی طرف چل دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہیلن اس کے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔

کلیو نے اپنی رفتار کم نہ کی حالانکہ ہیلن اسے پکارتی رہی۔ اس نے ہیلن کی

نے اپنا سر جھکایا اور اس کے دو نیلے دانت ہیلن کی شہ رگ میں پھوست ہو گئے۔ خون کی ایک بہتی لکیر ہیلن کی گردن سے اس کے سینے تک رینگ گئی۔ کونٹ ڈریکولا بڑی رغبت سے ہیلن کا خون چوس رہا تھا۔ دس سال بعد آج اس کی پیاس بجھ رہی تھی۔



اور ہیلن کی ایک دل خراش چیخ اس تہ خانے میں گونج گئی۔ اور ایسی چیخ پورے دس سال بعد آج پہلی دفعہ اس قصر میں گونجی تھی قہر کی سنگین دیواروں، خاموش اور اندھیری گزر گاہوں کے لئے اور خود کلیو کے لئے ایک دل نواز نغمہ تھی۔

ہیلن بھر چیختی..... وہ پلٹی..... وہ اس تہ خانے سے نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ بھاگ جانا چاہتی تھی۔ وہ کسی بھی طرف بھاگ جانا چاہتی تھی۔

لیکن کس سے ایک دبلا پتلا سایہ نکل آیا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا کلیو خوف سے سمٹ گیا اور بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس دبلے پتلے شخص کے کندھوں سے وہ لبادہ لٹک رہا تھا جو اس وقت، جب ایلن تہ خانے میں آیا تھا، دیوار کی ایک کھوٹی سے ٹنگا ہوا تھا۔ وہی سرخ دھاریوں والا کالا لبادہ۔ قصر کا آقا ہیلن کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ لمبوتر اور مردے کی طرح زرد تھا رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اور حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھوں میں عجیب چمک اور اس چمک میں عجیب قوت تھی جو کسی کو بھی جکڑ سکتی تھی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہیلن کی طرف بڑھا دیئے۔ ہاتھوں کی پہلی اور لائی انگلیاں شکاری پرندے کے پنجوں کی طرح تھیں۔ ہیلن لڑکھڑاکر ایک طرف جھک گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے ہوش ہو چلی تھی یا شاید ہو چکی تھی۔ کالے لبادے والے پتلے ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔

اور اس کے پیلے ہونٹ اس کے دانتوں پر کھنچ گئے، دو لانبے اور نوکدار دانت چمکنے لگے..... کونٹ ڈریکولا مسکرا رہا تھا۔ اس نے ہیلن کے بے جان سے سر کو ایک طرف کر کے کندھے پر دھلکا دیا۔

بے ہوش عورت کی گردن میں ایک رگ، پھڑک رہی تھی، شہ رگ کونٹ ڈریکولا

چکے تھے۔

”میرے خدا اکیارہ بج گئے!“ وہ بڑبڑایا ”لیکن ایلن اور ہیلن نے ہمیں جگایا کیوں نہیں۔ یا وہ بھی اب تک پڑے سو رہے ہیں؟“

”وہ دونوں یہاں نہیں ہیں؟“

”کیا۔ آ۔ آ۔؟“

”وہ یہاں نہیں ہیں۔“

”تو کہاں گئے ہیں؟“

”چلے گئے۔“

چارلس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی لیکن سمجھ نہ سکا۔

”چلے گئے! کیا مطلب؟“

ڈائنا کی آنکھیں غم تھیں۔

”بالکل ہی چلے گئے“ اس نے روئی سی آواز میں جواب دیا۔

”یہ کیا ایک ہی بات رٹے جارہی ہو۔؟ صاف صاف کہو۔“

”وہ لوگ یہاں نہیں ہیں اور ان کا سامان بھی غائب ہے“

ڈائنا نے یہ بڑی عجیب بات کہی تھی چنانچہ اس کی پلکوں میں پھنسے ہوئے نیند کے کلزے خود بخود جھڑ گئے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے!“

اس نے ایک دولتی سی جھاڑ کر لٹاف ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ڈائنا پیاری تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟“ اس نے کہا اور اپنی ٹانگیں پٹنگ سے نیچے لٹکادیں۔

ڈائنا نے جواب دیئے بغیر نفی سر ہلا دیا۔

ایک ہاتھ اس کندھے کے گوشت میں اترا جا رہا تھا اور اسے بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا اور وہ ایک خواب میں اپنے آپ کو اس کو جوان کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو اسے بکھی پر سے گھسیٹ کر نیچے نیچے دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

”چارلس!..... اٹھو۔“

اور اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن دوسرے ہی لمحے پھر بند کر لیں۔ وہ دوبارہ سو جانا چاہتا تھا۔ کافی دن چڑھ آیا تھا اور روشنی بند پوٹوں میں سے اس کی آنکھوں میں پہنچ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ وہ لوگ شاید دیر تک سوتے رہے تھے۔ گزشتہ کل کی پریشانی کے بعد یہ گہری پرسکون اور طویل نیند ایک نعمت تھی۔

ڈائنا اس کے بستر کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ڈریسنگ گاؤن میں بے حد پرکشش اور حسین معلوم ہو رہی تھی۔ رات بھر کی نیند نے اسے تازہ دم کدیا تھا۔ اور اس کے رخساروں کے گلاب کھل اٹھے تھے۔ چارلس کو اپنی بیوی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ بڑی فرمانبردار اور وفا شعار تھی لیکن کبھی کبھی وہ بڑی مستعدی کا ثبوت دیتی تھی اور اس وقت چارلس کا خود ڈائنا سے اس کی شکایت کرنے کو جی چاہتا تھا۔ مثلاً یہ کہ اب اس وقت خواہ خواہ اسے بیدار کر دینے کی کیا ضرورت تھی وہ اپنی مرضی سے اٹھتا اور دو چار تمیدی جمائیاں لینے کے بعد بستر میں سے نکلتا۔ بہر حال وہ بڑی بے دلی سے ایک کنبی کے بل نیم دراز ہو گیا۔

”کیا بات ہے“ اس نے کہا۔

اور پھر کروٹ لے کر اس ٹائم پیس کی طرف دیکھا جو میز پر رکھی ہوئی تھی گیارہ بج

وہ کمرہ عبور کر کے آتشدان کے قریب پہنچا۔ آتشدان خالی اور صاف تھا اس کے پیدے میں راکھ کا ایک ذرہ تک نہ تھا حالانکہ گذشتہ رات اس آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔

”کہاں ہے وہ الو کا پٹھا؟“ چارلس نے ایک دم سے پوچھا۔

”کون؟“ ڈانٹا سہم گئی۔

”وی۔ کیا نام تھا اس کا؟“۔۔۔۔۔ ہاں۔ کلیو۔“

”وہ بھی نہیں ہے“

”نہیں ہے!“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں نے اسے بلانے کے لئے گھنٹی بجائی تھی۔ لیکن جب وہ نہ آیا تو۔۔۔۔۔“

”تو کیا کیا تم نے؟“

”میں اسے دیکھنے کے لئے نیچے گئی۔ وہ کہیں نہ تھا۔ کلیو بھی غائب ہے

بڑی عجیب اور مضحکہ خیز بات تھی یہ تو۔ اس معصے کا ایک نہ ایک منطقی جواب

ہو گا ضرور۔ یہ تو تسلیم ہی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ الین، ہیلن اور کلیو راتوں رات غائب

ہو گئے تھے۔ چارلس کمرے میں سے نکل آیا۔ گزرگاہ عبور کر کے برآمدے میں اور

زنہ کے ماتھے پر آگیا۔

”کلیو۔“ اس نے آواز دی۔

نیچے کا بڑا کمرہ خالی تھا۔ گزشتہ رات جس میز کے گرد بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا

تھا۔ وہ میز وہیں موجود تھی۔ لیکن تنگی تھی۔

”کلیو۔“ وہ پھر چیخا۔

لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ ہاں البتہ اس کی آواز قصر کی سنگین دیواروں سے ٹکرا کر

اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا ڈریسنگ گاؤن اٹھایا اور اسے پہنتا ہوا کمرے میں سے نکل کر گزرگاہ میں آگیا۔ ڈانٹا اس کے پیچھے تھی۔ دونوں اس کمرے میں پہنچے جو الین اور ہیلن کو دیا گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے کمرے میں ایک نظر ڈالی تو چونکا۔ یہ شاید الین اور ہیلن کا کمرہ نہ تھا۔ یہ تو کوئی انجانا سا کمرہ تھا۔ گذشتہ رات چونکہ وہ تھکن اور نیند سے چور ہو رہا تھا اس لئے اسے اپنے بھائی اور بھابی کا کمرہ یاد نہ آ رہا تھا اور اس وقت وہ شاید غلطی سے دوسرے کمرے میں آگیا تھا۔

کمرہ صاف ستھرا تھا اور پلنگ پر صرف ایک چادر بچھی ہوئی تھی اور اس کمرے میں کچھ نہ تھا۔ نہ تو سامان تھا نہ کچھ اور بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کمرہ ایک عرصے سے استعمال نہ کیا ہو۔

وہ پلٹ پڑا۔

ڈانٹا نے کہا ”یہ انہی کا کمرہ ہے“

”ایں!“ اس نے احتمول کی طرح منہ پھاڑ دیا۔

”یہ وہی کمرہ ہے چارلس۔ میں جانتی ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ یقین کرو تم

کسی دوسرے کمرے میں نہیں آگئے ہو بلکہ یہ وہی کمرہ ہے اور یہ میں یقین سے کہہ

رہی ہوں۔“

چارلس کو بھی اس کا یقین تھا لیکن وہ یقین کرنا نہ چاہتا تھا کیونکہ چند حقائق اس

کے حافظے سے دست و گریباں تھے۔ اگر واقعی یہ ان کا کمرہ تھا تو الین اور ہیلن کہاں

تھے؟ ان کا سامان کہاں تھا؟ نہ تو ان دونوں کا کہیں پتہ تھا۔ اور نہ ان کے سامان کا

چنانچہ یہ یقین کر لینا آسان نہ تھا۔ اس کے برخلاف یہ سمجھ لینا آسان تھا کہ وہ غلطی

سے کسی دوسرے کمرے میں آگئے تھے اور یہ بات قرن قیاس بھی تھی۔ یہ تو ہو نہیں

سکتا تھا کہ الین اور ہیلن ہوا بن کر اڑ گئے ہوں۔

لوٹ آئی، بالکل اسی طرح جس طرح گزشتہ رات وہ دروازہ کھول کر قصر کے مالک
پکار رہا تھا۔ تو اس کی آواز خود ہی بازگشت پیدا کر کے خاموش ہو جاتی تھی۔
چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے ڈانٹا سے کچھ کہنے کے لئے پیچھے گھوم کر
دیکھا۔ لیکن ڈانٹا وہاں نہ تھی۔ وہ بھی غائب تھی۔ یہ کیا راز تھا؟ کیا اس پر اسرارِ قہر
میں انسان ہو میں تحلیل ہو جاتے تھے؟



”چارلس بے حد پریشانی کے عالم میں اسی جگہ سے پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف
بھاگا۔ ڈانٹا کمرے میں ہی تھی، نہ صرف کمرے میں تھی بلکہ سوٹ کیسوں میں کپڑے
ٹھونس رہی تھی۔ ڈانٹا کی ذات میں بڑا رکھ رکھاؤ تھا۔ اور وہ ہر چیز قرینے سے اور
لباس تمہ کر کے احتیاط سے رکھنے کی عادی تھی، لیکن اس وقت وہ باقاعدہ کپڑے اور
لباس سوٹ کیسوں میں اندھا دھند ٹھونس رہی تھی چنانچہ معلوم ہوا کہ انتہائی خوف
سے اس کے حواس باختہ ہو رہے تھے۔

”یہ کیا کر رہی ہو تم؟“ چارلس نے پوچھا۔
”میں اس قصر سے فوراً چلی جانا چاہتی ہوں۔“
”اے!..... یعنی.....“

”سنائیں..... میں یہاں سے فوراً چلی جانا چاہتی ہوں۔“
”یعنی..... میرا مطلب ہے۔ ہیملن اور ایلن کے بغیر ہی.....؟“
”کیا وہ دونوں ہمیں چھوڑ کر نہیں چلے گئے؟“

”ہاں..... میں..... نہیں جانتا..... یہ نہ تم کہہ سکتی ہو، اور نہ میں کہ.....۔“
”وہ کسی طرف بھی گئے ہوں۔“ ڈانٹا نے ہچکی لے کر کہا ”بہر حال وہ چلے گئے اور
نہ تو ہم سے کہہ کر گئے اور نہ کوئی پیغام ہی چھوڑ گئے۔ اور میں بھی یہاں سے چلی جانا
چاہتی ہوں۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“

”ابھی اور اسی وقت۔۔۔“ اس نے چیخ کر کہا۔

چارلس نے پہلے کبھی اپنی بیوی کو اس عالم میں نہ دیکھا تھا۔ وہ غصے بھی تھی، خوفزدہ بھی اور رو بھی رہی تھی چنانچہ اس وقت اسے کچھ سمجھانا مناسب نہ تھا۔ جب تک کہ وہ اس قعر سے باہر نہیں نکل جاتے بحث فضول تھی۔ ڈانٹا اس وقت اپنے آپ میں نہ تھی۔

چنانچہ وہ اپنی بیوی کا ہاتھ پٹانے لگا ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی باتوں سے اس کا غصہ اور خوف دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب چونکہ چارلس نے اس کی بات مان لی تھی اس لئے ڈانٹا بھی اسے خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی لیکن وہ اپنے جذبات پر قابو حاصل نہ کر سکی اس کے ہاتھ بدستور کانپتے رہے اور چند ثانیوں بعد ہی وہ ایک بار پھر سوٹ کیسوں میں کپڑا ٹھونس رہی تھی۔

سوٹ کیس وغیرہ خاصے وزنی تھی۔ چنانچہ چارلس نے چاہا کہ تھوڑا سا سامان بیس چھوڑ دیا جائے اور بعد میں کسی کو بھیج کر منگوا لیا جائے یا پھر کل سامان فی الحال یہی پڑا رہنے دیا جائے اور وہ دونوں خالی ہاتھ قعر سے نکل پڑیں۔ چوراہے پر اگر کوئی راہ گیر مل گیا تو اسے منہ مانگی رقم دے کر سامان لانے کے لئے بھیج دیں گے۔ لیکن جب اس نے ڈانٹا کی صورت دیکھی۔ تو اس نے یہ مشورہ اپنے پاس ہی رکھا اس کے بشرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ چارلس کا یہ مشورہ کسی صورت تسلیم نہ کرے گی اس منحوس قعر میں ان کی کوئی چیز حتیٰ کہ ایک تنکا تک باقی نہ رہنا چاہئے۔ اپنا کل سامان لے کر اس بھیانک اور پراسرار قعر سے نکلنا اور بھولے سے بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا تھا۔

ان دونوں نے دو سوٹ کیس اٹھائے اور گزر گاہ کو عبور کر کے آہستہ آہستہ زنہ

اترنے لگے۔

ان کے پیروں کی چاپ خالی ویران کمرے میں بڑی بھیانک انداز میں گونج گئی۔ یہ کمرہ انہیں گزشتہ رات بے حد آرام دہ اور خوشگوار معلوم ہوا تھا۔ لیکن آج یہی کمرہ اجاز اور بھیانک تھا۔ کمرہ اس کی ہر چیز بلکہ پورا قعر جیسے تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کی ایک ایک چیز سے کھڑکیوں اور دروازے سے اور اس کی دیواروں اور پردوں سے ایک عجیب طرح کی ہیبت ٹپک رہی تھی ایک ایسی ہیبت جس کا تعلق اس دنیا سے قطعی نہ تھا۔ اور اب چارلس نے بھی دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ اگر وہ اس قعر سے نکل آئے، صحیح سلامت نکل آئے تو یہ واقعی ان کی خوش قسمتی ہوگی۔

باہر فضا سرد تھی اور ہوا کے جھوکوں میں استرے کی سی کٹ تھی وہ دونوں پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر صحن عبور کر کے پل پر آگئے۔ خندق کے پانی پر برف جمی ہوئی تھی۔ وہ اسے عبور کر رہے تھے۔ کہ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور ان کے کھلے ہاتھوں اور رخساروں پر سرد تھپڑ مار کر گزر گیا۔ برف باری شروع ہو چکی تھی۔ برف روئی کے گالوں کی طرح گر رہی تھی اور ہوا کے جھوکے ان گالوں کو اڑاتے پھر رہے تھے کہیں کوئی ٹھنڈا ہوا لومڑا اپنی کمرہ آواز میں چیخ رہا تھا، لومڑی اس ایک آواز کے علاوہ ہر طرف موت کی سی خاموشی تھی۔

کوئی سو گز تک چلتے رہنے کے بعد وہ قعر ڈریکولا کی سرد سے نکل آئے۔ اور تب ڈانٹا نے سوٹ کیس زمین پر رکھ دیئے اور کئی دفعہ اپنے ہاتھوں کو ہلایا۔ اور آپس میں رگڑ کر انہیں گرم کیا کیونکہ وہ ٹھنڈے چلے تھے۔ ڈھلان اترتے وقت انہیں راستہ میں سستانے کے لئے کئی دفعہ رکنا پڑا، گزشتہ رات جب وہ یہ ڈھلان چڑھے تھے تو ان کی رفتار تیز تھی کیونکہ وہ اس بجھی میں سوار تھے جسے وہ پراسرار اور سیاہ گھوڑے کھینچ رہے تھے لیکن اس وقت ان کی رفتار بے حد ست تھی، کیونکہ وہ پیدل تھے اور پھر

سامان بھی اٹھائے تھے۔

چارلس کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ دونوں اس قصر کے پراسراریت معلوم کیے بغیر اس میں سے نکل آئے تھے جیسے جیسے وہ قصر سے دور ہوتا جا رہا تھا اس کی بے چینی اور شوق تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ ڈانٹا کے دماغ پر فرار..... صرف فرار سوار تھا، لیکن جب وہ یہاں سے دور پہنچ جائیں گے اور خدا کا شکر ادا کر رہے ہونگے۔ کہ وہ یہاں سے صحیح سلامت نکل آئے تو پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟۔ اپنے وطن میں پہنچ کر وہ ہیلن اور ایلن کی گمشدگی کے متعلق اپنے دوستوں سے کیا کہیں گے؟ کیوں کہ یہ تو انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ ان دونوں کے ساتھ کیا واقعہ ہوا تھا؟ وہ آسمان پر چلے گئے یا زمین میں دھنس گئے؟ کوئی پیغام اور اپنا کوئی نشان تک چھوڑے بغیر وہ دونوں آخر کہاں جا سکتے تھے؟

”شاید رات کے وقت وہ دونوں کسی وجہ سے خوفزدہ ہو گئے اور راتوں رات قصر سے نکل کر کسی طرف چل دیئے۔“ چارلس نے خود اپنی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی۔

لیکن اگر ایسا ہی تھا تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ ایسی بھی کیا بات تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی کچھ کے بغیر فرار ہو گئے تھے؟ نہیں یہ ممکن ہی نہ تھا۔ کہ وہ دونوں ڈانٹا اور چارلس کو اپنے ساتھ لئے بغیر چلے جاتے۔

ڈانٹا اور چارلس ڈھلان سے اتر کر چوراہے پر پہنچ گئے انہوں نے اپنا اپنا سامان لکڑہارے کی جھونپڑی کے قریب رکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔

چاروں سمتوں میں جاتے ہوئے چاروں راستہ خالی اور ویران تھے۔

چارلس نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا جس طرف سے وہ آئے تھے۔ قصر ڈریکولا کی فصیل اور برج، جن کی چوٹیاں برف کے گالوں کی وجہ سے سفید ہو رہی

تھیں۔ یہاں سے نظر آتے تھے، یہ قصر اور اس کے برج کسی بھی ٹھکے ہوئے مسافر کو لپکا کر اپنی طرف کھینچ سکتے تھے۔ اس دیرانے میں یہ قصر بڑی ہی پرکشش تھا۔ اور مسافر اس کی طرف دیکھنے کے فوراً بعد ہی اس پر بیچ راستے پر چل پڑتا جو اوپر جاتا تھا۔ قصر ڈریکولا کی طرف جو اسرار کا گڑھ تھا۔ نہیں وہ اس طرح یہاں سے نہیں جاسکتا اگر اس کے بھائی اور ہیلن کے ساتھ اس قصر میں کوئی واقعہ ہوا تھا۔ تو پھر اس کا یہ فرض ہو جاتا تھا کہ وہ اس کے متعلق تحقیق کرے اور وہ تحقیق کرے گا۔

ڈانٹا نے اس کی دلی کیفیت معلوم کر لی۔ چنانچہ بولی۔

”چارلس! نہیں..... خدا کے لئے نہیں..... تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ.....“

”ڈانٹا! میرا ایک بار پھر وہاں جانا بہت ضروری ہے۔“

”میری خاطر چارلس.....“

”لیکن میرے بھائی ایلن کا کیا ہوا؟ میری بھابی ہیلن کا کیا ہوا؟ کیا جواب دوں گا؟ میں لوگوں کو؟ اور اگر میں اس وقت انہیں چھوڑ کر چلا گیا اور بعد میں کبھی ان کے متعلق کوئی خبر نہ ملی تو میرا ضمیر مجھے ملامت نہ کرے گا۔؟“

”کیا میری زندگی اجیرن نہ ہو جائے گی۔؟“

”کم سے کم میری ایک بات تو مان لو۔“

”کون سی بات؟“

”ہم جوزف باد چلتے ہیں۔“

”اچھا پھر؟“

”پھر ہم مدد لے کر آجائیں گے۔“

”کیسی مدد اور کسی کی مدد ڈانٹا؟“

”کچھ ہی کیوں ہو جائے؟“ ڈانٹا نے بڑے میکانیکی انداز میں دہرایا۔

چارلس نے اسے اپنی بانسوں میں سمیٹ لیا اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولا ”ڈانٹا میں بلاوجہ کوئی خطرہ مول نہ لوں گا اس کا میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”سچ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں سچ کہہ رہا ہوں۔“ چارلس نے اسے یقین دلایا ”لیکن بہر حال معلوم کرنا ہے کہ ایلن اور ہیلن کے ساتھ کیا واقعہ ہوا۔ یہ تو بڑی بزدلی ہے کہ ہم خاموشی سے اپنی شکست قبول کر لیں۔“

”شکست! کون شکست دے رہا ہے ہمیں؟“

”وہ..... وہ..... ایک خالی مکان۔“

”چارلس!“

”کیا ہے؟“

”پانچ بجے اندھیرا اتر آتا ہے۔“

”لیکن تم اندھیرے سے نہیں ڈرتی؟“

”اس جگہ یہاں ڈرتی ہوں۔“

”بہت اچھا۔ میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔“

اور اس نے ڈانٹا کے ہونٹ چوم لئے، ڈانٹا نے اس بوسے کا جواب بڑے خلوص سے دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے آپ کو ڈانٹا سے الگ کر چکا تھا اور اس سے پہلے کہ موخر الذکر کچھ کہتی یا کوئی التجا کرتی وہ اس راستے پر چل پڑا۔ جو قصر ڈریکولا تک جاتا تھا۔

دن کی روشنی میں قصر ڈریکولا ایک بے حد معصوم قدیم عمارت معلوم ہوتا تھا۔ اور اس عمارت کے مختلف حصوں کی تعمیر مختلف ڈھنگ سے کی گئی تھی۔ چارلس نے

”وہاں کے باشندوں کی۔“

”کوئی ہماری مدد نہ کرے گا۔“

”آخر کیوں؟“

”اس لئے کہ مقامی لوگ اس قصر کے وجود کا اقرار ہی نہیں کرتے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ قصر موجود ہے۔ کوچوان نے بھی انکار کر دیا تھا اس نے قصر کی طرف دیکھا تک نہیں۔ یہاں کے لوگ اس کے متعلق کچھ بھی کہنے کو تیار نہیں ہیں پھر وہ ہماری مدد کیا کریں گے؟“

”ڈانٹا نے گردن گھما کر قصر کی طرف جاتے ہوئے راستہ پر نظری جیسے اسے خوف ہو کہ کوئی دم میں وہی پراسرار کوچوان کی تبھی آتی نظر آئے گی۔

”بہت اچھا۔“ اس نے کہا۔ اگر ہمیں واپس جانا ہی ہے تو.....“

”تم نہیں ڈانٹا۔“ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ چارلس نے کہا۔

”اور میں؟“

تم یہیں رہو۔ اگر کوئی تبھی یا کوچ گاڑی اس طرف سے گزرے تو اسے روکنے کی کوشش کرنا۔ بشرطیکہ وہ بے کوچوان کی نہ ہو۔ اب اگر تم کوچوان کو قصر تک آنے کے لئے تیار کر سکو تو کہنا۔“

”اور اگر وہ نہ آئے تو؟“

”تو پھر تم خود جوزف باد چلی جانا، کم سے کم ہمارا سامان ہی بھیج دینا اور تم اسی جگہ میرا انتظار کرنا۔“

”انتظار کروں؟“ ڈانٹا نے خوف سے کانپ کر کہا۔

”اس وقت دھائی بج رہے ہیں۔“ چارلس نے کہا۔ ”میں ساڑھے چھ بجے تک

واپس آجاؤں گا، خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔“

ناجس طریقے سے وہ نمودار ہوا تھا اور ایلن اور ہیلن.....
اور خیالات کا دھاگہ یہاں کٹ سے ٹوٹ گیا۔

یہ بات قرن قیاس نہ تھی کہ ان کے ساتھ کوئی واقعہ ہو گیا ہو۔ ایلن دولت مند فرد تھا۔ لیکن اتنا بھی نہ تھا کہ اس کے ساز و سامان میں کوئی قیمتی چیز ہو، چنانچہ اب کسی نے ایلن اور ہیلن کو اس غرض سے کہیں قید کر دیا تھا کہ وہ بعد میں چارلس سے زر رنگاری طلب کرے تو یہ اس کی حماقت تھی۔ کیونکہ انگلستان سے اتنی بڑی رقم منگوانے کے لئے کافی وقت درکار تھا۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ کوئی بھی ڈاکو اتنا گدھا تو نہیں ہو سکتا چنانچہ کسی ڈاکو یا راہزن نے ان دونوں کو روپے کے لالچ میں گم نہ کیا تھا اور اس کے متعلق سوچنا فضول تھا۔

چارلس زینہ چڑھ کر گزر گاہ اور وہاں سے خوابگاہ میں پہنچا۔ اس نے اس کمرے کا ایک ایک کونہ دیکھ ڈالا اور ایک ایک چیز کو بار بار اور بڑی باریک بینی سے دیکھا۔ لیکن اسے کوئی ایسی چیز نہ ملی جو ہیلن اور ایلن کی گمشدگی کے معے کو حل کر سکتی یا اس پر کم سے کم کچھ روشنی ہی ڈال سکتی

گزر گاہ کی کھڑکیوں میں سے اس نے قصر کے اندرونی صحن میں نظریں ڈال کر قصر کا سایہ صحن میں اس سرے سے اس سرے تک بچھا ہوا تھا صحن اجاڑ اور سرد تھا اور اس تک پہنچنا ناممکن تھا۔ تاہم وہ قصر کی طرح خوفناک اور ڈراؤنا معلوم نہ ہوتا تھا صحن کے انتہائی سرے پر دیوار تھی اور دیوار کے عقب میں بلند وبالا اور سائے دار درختوں کی قطار اور یہ درخت یوں کھڑے تھے جیسے کسی محاذ پر سپاہی صف بنائے کھڑے ہوں۔
چارلس آگے بڑھا۔

وہ دروازے کھول کر خالی خوابگاہوں اور فرنیچر سے محروم نیچے کمروں میں جھانکتا رہا۔ قصر ڈر کیولا نہ تو کسی کا گھر تھا اور نہ ہی قابل دید مقام جسے دیکھنے کے لئے سیاح

اس قصر کو زیادہ اور کوئی خاص اہمیت دینے کی کوشش نہ کی وہ اس قصر کو بس ایک قدیم عمارت ہی یقین کرنا چاہتا تھا جس کی تعمیر مختلف زمانوں میں مختلف معماروں نے کی تھی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر اس نے اس قصر کو پراسرار نہ سمجھا اور اپنے دل میں خوف دہرا اس کو جگہ نہ دی تو اس کا کام آسان ہوگا۔ وہ بڑے اطمینان سے اس کے اسرار معلوم کر سکے گا بشرطیکہ اس میں اسرار ہوں۔

اور جب وہ خندق کا پل عبور کر رہا تھا تو اب پہلی دفعہ اس نے دیکھا کہ یہ پل مرمت طلب تھا اور خندق کا پانی جم کر سج ہو گیا تھا اور اس کی سطح پر بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ یہ پتھر قصر کی فصیل اور بیروں پر سے ٹوٹ کر گرے تھے، گزرے ہوئے زمانے کے اثرات اس پر اب بوجھ بن چلے تھے۔ جگہ جگہ سے قصر کی دیواروں کا پلاسٹر اکڑ رہا تھا اور پتھر اپنی جگہ سے اکھڑنے لگے تھے تاہم یہ قصر مضبوط تھا، بے حد مضبوط تھا۔ اور پٹاری کی چوٹی پر اپنے برج اٹھائے ایک ابدی پاسبان کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ مستحکم عظیم اور پرہیزگاری کے بعد بھی یہ آج کے زمانے میں بھی اسرار لوگوں کے دلوں پر طاری تھے، بھول چکے ہوئے اور ان اسرار کو بھی فراموش کر چکے ہوئے جو اس کی سنگین چار دیواری میں بند ہیں کوئی نہ جانے گا کہ یہ کھنڈر ایک قصر تھا اور کسی کو معلوم نہ ہو گا کہ اس قصر کا مالک کون تھا؟

چارلس دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے کواڑوں کو آہستہ سے دھکیلا وہ کھل گئے۔ گزشتہ رات انہوں نے اس بڑے کمرے اور اپنی خوابگاہوں کے علاوہ اس قصر کا کوئی اور کمرہ نہ دیکھا تھا اور نہ ہی چارلس کو اس بات کی دھن تھی کہ وہ قصر اندرون کا کھوج لگائے چارلس نے تجسس طبیعت نہ پائی تھی اور اگر حالات مختلف ہوتے تو وہ قصر کے کمروں اور گزر گاہوں میں ٹانگ جھانک کرنے کو بد اخلاقی سمجھتا، لیکن اس کا مالک زندہ نہ تھا اور وہ تھا ایک ملازم اسی پراسرار طریقہ سے غائب ہو گیا

سے نہیں بلکہ کہیں نیچے سے آ رہی تھی ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس کے پورے بدن کو چھوڑ کر صرف اس کے ٹخنوں کو چھوتی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے پردے کا ایک حصہ ذرا سا ہٹا دیا، دوسری طرف ایک تاریک دروازہ تھا جس کے کواڑ نہ تھے اس دروازہ سے ایک زینہ شروع ہو کر کہیں نیچے چلا گیا تھا اوپر کی چند سیڑھیاں گزر گاہ سے آتی ہوئی روشنی میں نظر آ رہی تھی، اور بعد کی سیڑھیاں گھپ اندھیرے میں گم تھیں۔

ایلن اس گزر گاہ میں چلتا ہوا، اسی طرف آیا ہوگا اور اسے بھی پردے کے پیچھے دیوار میں یہ دروازہ مل گیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اسے اپنی خواب گاہ میں سے نکلنے اور یہاں تک آنے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟ اور وہ یہاں تک کیوں آیا تھا؟ اگر آیا تھا تو نیچے کیوں گیا تھا اور ہیلن بھی اس کے پیچھے پیچھے کیوں گئی؟

چارلس جہاں تھا وہیں شش و پنج کے عالم میں کھڑا رہا۔ وہ اس زینے کے ذریعہ نیچے اترنے سے ہچکچا رہا تھا، ایلن اور ہیلن اسی راستہ سے جا کر غائب ہو گئے تھے نیچے کے کمرے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی عفریت کوئی بلا جس نے ان دونوں کو کسی طرح اپنی طرف کھینچ لیا تھا اور پھر انہیں نگل لیا تھا بہت ممکن تھا کہ وہ بلا سے یا جو کچھ بھی وہ تھا۔ اب بھی اس زینہ کے قدموں میں موجود ہو اور اب بھی وہ بھوکا اور پیاسا ہو۔

لیکن وہ کیا ہو سکتا تھا؟ اس ویران اور غیر آباد قصر کے یہ خانہ میں کون ہو سکتا تھا؟ وہ دل کڑا کر کے زینے کی طرف بڑھا۔

دروازہ نیچا تھا چنانچہ چارلس کمر میں سے ذرا جھک گیا کہ اس کا سر محراب سے ٹکرائے جائے۔ وہ دھڑکتا دل لئے ٹیڑھیاں اترنے لگا چند سیڑھیوں کے بعد اوپر سے آتی ہوئی روشن غائب ہو گئی لیکن آگے کی سیڑھیاں پھر روشنی تھیں اوپر چھت میں

آتے، یہ ایک لاوارث اور ترک شدہ عمارت تھی اس کے باوجود..... اس میں قالین بچے ہوئے تھے، دیواروں سے پردے لٹک رہے تھے، اور گزشتہ کی ٹخنی منزل کے بڑے کمرے کے آئینہ میں نہ صرف آگ جل رہی تھی، بلکہ ان چاروں مسافروں کے لئے کھانا بھی تیار کیا گیا تھا، اور چارلس کی عقل اس معرکہ کو حل کرنے سے قاصر تھی۔ اس نے قصر کے باورچی خانے میں جانے کا فیصلہ کیا یقیناً وہاں سے یہ سراغ تو مل ہی جائے گا۔ کہ گزشتہ رات وہاں کھانے پکایا گیا تھا، شاید کلیو پھر نمودار ہو جائے، شاید اسے بولنے پر مجبور کیا جاسکے اور وہ اس راز پر سے پردہ اٹھا سکے اور چارلس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ اگر اس کی مدد بھی نہ کی جائے تو وہ اسے مجبور کر دے گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو وہ تشدد سے بھی کام لے گا..... ہر طور وہ کلیو سے یہ راز آگوائے گا۔

وہ گزر گاہ میں چل پڑا ایک دیوار پر کا پردہ آہستہ آہستہ تقریباً نامعلوم طور پر مل رہا تھا۔ اوپری منزل تقریباً نکلی تھی البتہ کہ محض رسا اس میں سجاوٹ کی چند چیزیں رکھ دی گئی تھیں اور یہ پردہ انہی چند چیزوں میں سے ایک تھا۔ قصر کی اس منزل میں آنے والے کے دل میں لامحالہ یہ خیال گزرتا تھا کہ اس منزل کے تمام کمروں کے، سوائے ان دو خواب گاہوں کے جن میں چارلس اور اس کے ساتھیوں کا قیام رہا تھا، قصداً سجاوٹ اور فرنیچر وغیرہ سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اور ان چیزوں کو اس بڑے کمرے میں سجایا گیا تھا۔ جہاں بیٹھ کر چارلس اور اس کے ساتھیوں نے گزشتہ رات کھانا کھایا تھا۔

چارلس کے قدم رک گئے۔

پردہ بدستور مل رہا تھا اور سرد ہوا اس کے ٹخنوں سے لپٹ رہی تھی، حالانکہ اس طرف ایک بھی کھڑکی نہ تھی اور اگر تھی بھی تو وہ بند تھی، اس کے علاوہ گزر گاہ میں

اور اب اس نے دیکھا کہ تابوت پر ڈھکن نہ تھا وہ تابوت سے چند قدم دور ایک ستون سے کمر لگا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

چارلس جہاں تھا وہیں کھڑا ہوا تھا وہاں سے وہ تابوت میں نہ دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک کافی بلند چوکی پر دھرا ہوا تھا۔ لیکن اتنا تو اسے یہاں سے بھی نظر آ رہا تھا۔ کہ عظیم تابوت کے اوپری کنارے چوٹی تھے یعنی اس چوٹی تابوت کے کنارے تھے جو اس بڑے عظیم چبوترے میں رکھا ہوا تھا یعنی مردہ بیٹی اور اس مردہ بیٹی پر بھی ڈمکن نہ تھا۔

چارلس آگے بڑھا۔ تجتس اسے آگے بڑھا رہا تھا لیکن مردے کا احترام اس کے قدم روک رہا تھا۔

تاہوت کی چوکی کے سائے میں ایک بڑا سا صندوق رکھا ہوا تھا، اس کا ڈھکن بند تھا۔ لیکن چارلس نے دیکھا کہ مقفل نہ تھا لمحہ بھر کے شش و پنج کے بعد وہ جھکا دو نول ہاتھوں سے پکڑ کر اس کا ڈھکن کھول دیا۔

اور ایلن کی بے نور پھٹی ہوئی آنکھیں چارلس کو دیکھ رہی تھیں۔

اس کا سر بڑے ہی قدرتی زاویے سے مڑا ہوا تھا۔ ابتداء میں تو چارلس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اور نہ ہی اس نے سنسنی محسوس کی پھر احساس ہوا کہ ایلن کے اعضاء کا تناسب بگڑا ہوا کیوں تھا۔ اور اس کا سر وہاں کیوں نہ تھا جہاں اسے ہونا چاہئے۔

ایلین کا کٹا ہوا سر اس کی لاش کے سینے پر بڑی بے پروائی سے پھینک دیا گیا تھا۔ جہاں ایلین کی گردن کو ہونا چاہئے وہاں کچھ نہ تھا البتہ وہاں سے خون نے بہہ کر اس کے کپڑوں کو سرخ رنگ میں رنگ دیا تھا، کپڑوں پر اور کئی ہوئی گردن پر اب خون جم کر سیاہ لہو تھڑوں میں تبدیل ہو رہا تھا خدا جانے کیا بات تھی کہ ایلین کی لاش ایک دم سے سکڑ گئی تھی یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے جسم کا تمام خون بہہ جانے کی وجہ سے

سے روشنی کی ایک نسبتاً موٹی لکیر در آئی یہ روشنی اس صحن میں سے آتی ہوئی تھی جسے اس نے گزر گاہ کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا..... چارلس نے اندازہ لگایا۔

اس کا خیال تھا کہ نیچے کوئی مختصر سا کمرہ ہوگا اور اس کا دروازہ پچھواڑے کے صحن میں کھلتا ہوگا۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ زینہ برابر نیچے نیچے اترتا رہا یہاں تک کہ چارلس سطح زمین سے بھی نیچے آگیا۔ آخر کار! اسے اپنے سامنے زینہ پر مدھم اور بھوری روشنی نظر آئی۔۔۔۔ اور وہ زینے کے نچلے سرے پر پہنچ گیا۔

سامنے ایک غار نما تہ خانہ تھا اور اس کے عین بیچ میں ایک چوکی پر تابوت رکھا ہوا تھا۔

تمہ خانے کے فرش پر قدم رکھنے سے پہلے اور آخری میزٹمی پر کھڑے ہو کر تمہ خانے کا تفصیلی جائزہ لیا پھر وہ آگے بڑھا لیکن ہر قدم اٹھانے کے بعد وہ دائیں بائیں دیکھ لیتا تھا وہ چوکتا تھا اور کسی بھی ناگمانی حملے کے لئے تیار تھا۔

تابوت کی چوکی پر حروف کندہ تھے چارلس اس سے چند قدم دور ٹھہر کر پڑھنے لگا۔
 ”کوئٹ ڈریگول۔“

آخری آرام گاہ جس کی حاتمہ مہبان نوازی سے وہ چاروں گزشتہ رات لطف اندوز ہوئے تھے چارلس کو کونٹ ڈریکولا کی حالت پر رحم آگیا غریب تن تھا قصر کے اس تمہ خانہ میں ابدی نیند سو رہا تھا اس تمہ خانہ کو تو خاندانی مقبرہ بنادینا چاہئے تھا جہاں ڈریکولا کے خاندان کے دوسرے افراد بھی دفن ہوتے ہوں گے ویسے تو اس ایک تما تابوت کی وجہ سے یہ تمہ خانہ کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا۔

وہ ایک طرف ہٹ گیا لاشعوری طور پر وہ بڑی خاموشی اور احترام سے چل رہا تھا بالکل اسی طرح جس طرح ہم اور آپ کسی پرانے قبرستان یا مقبرے کے قریب سے گزرتے وقت خود بخود سر جھکا کر احترام سے چلنے لگ جاتے ہیں۔

مراسراہٹ۔

چارلس نے اپنے آپ کو سنبھالا اپنی قوت سمیٹی اور ایک ہاتھ بلند کر کے تابوت کا کنارہ پکڑ لیا۔ اپنے آپ کو اسی ہاتھ کے سہارے اوپر اٹھایا اور گردن بڑھا کر تابوت میں دیکھا۔

تابوت میں ایک شخص اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے چت لیٹا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ لبادہ پہن رکھا تھا، جس پر خون کی سرخ رنگ کی دھاریاں تھیں اور اس کے ہاتھوں کی لمبی اور پتلی انگلیاں نہ تھیں، بلکہ وہ کسی خونخوار اور بیدرد شکاری کے پنچے تھے۔ اور اس کا چہرہ وہ بھی ایسا نہ تھا۔ جیسا کہ کسی مردے کا ہوتا ہے۔ یعنی زورانی اور پر سکون اس کا چہرہ لمبوتر اور ستا ہوا تھا۔ اور اس سے بڑی سفاکی عیاں تھی یہ ابدی نیند سوئے ہوئے کسی نیک مرد کا نہیں بلکہ کسی ظالم اور سفاک چہرہ تھا۔ ایسے شخص کا جس کے سینہ میں دل نہ ہو اور جو شکار خور ہو۔ اس کے ہونٹ پتلے تھے اور بالائی ہونٹ کے دونوں کونے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے کیونکہ وہاں سے دو لالہ بے اور کیلے دانت، بھیرے کے دانتوں کے سے تھے اور باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ یہ ایک پر رعب چہرہ ہو سکتا تھا، شیطانیہ نے اس پر اپنے پنچے اس بری طرح گاڑ رکھے تھے کہ اس تابوت میں سونے والے کا چہرہ بے حد بھیانک اور لرزہ خیز بن گیا تھا۔

سڑے ہوئے گوشت اور خون کی مٹی آمیز بو کے بھبھکے اس شخص کے منہ سے نکل رہے تھے۔

چارلس کے قدم ڈمگائے اس کے ہاتھوں اور پیروں سے جان سرکنے لگی اور اس کی گرفت تابوت کے کنارے پر سے ڈھیلی پڑ گئی اور کنارہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

عین اس وقت تابوت والے نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔

لاش ایسی ہو گئی تھی کیوں کہ اگر ایسا ہی ہوتا تو نہ صرف ایلن کی لاش خود اس کے خون میں لت پت ہوتی بلکہ صندوق بھی خون سے بھر گیا ہوتا لیکن ایسا نہ تھا ایلن کے لباس پر اور صندوق کی دیواروں پر خون کے چند موٹے قطرے سے تھے اور بس۔

چارلس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبایا، منہ سختی سے بند کیا۔ اور کمر میں سے دوہرا ہو گیا۔ وہ قے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی سلاخیں تن گئی تھیں۔

آخر کار وہ اپنی قے روکنے میں کامیاب ہو گیا، وہ بری طرح سے ہانپ رہا تھا۔ اور اس کے ماتھے سے ٹھنڈا پسینہ بہہ کر اس کی آنکھوں میں داخل ہو رہا اور جلن پیدا کر رہا تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے ایک ہاتھ بڑھایا اور دھڑے صندوق کا ڈھکن بند کر دیا۔

چارلس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا، لیکن ٹانگوں نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس نے پہلا ہی قدم اٹھایا تھا کہ وہ لڑکھڑا گیا، جھکا اور دونوں ہاتھ بڑھا کر تابوت کی چوکی کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے دماغ میں خشک صحرائی گولے ناچ رہے تھے اور تابوت کی چوکی پر کندہ حروف اس کی نظر کے سامنے ناچ رہے تھے۔

اور عین اسی وقت تابوت میں، اور چارلس کے جھکے ہوئے سر کے عین قریب، کسی چیز نے حرکت کی،

چارلس جس حالت میں تھا اسی حالت میں بت بن گیا۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ تابوت میں کسی چیز نے حرکت کی تھی، یہ ناممکن تھا یہ شاید اس کا وہم تھا۔ یہ آواز شاید اس کے دماغ میں پیدا ہوئی تھی یا شاید اس کے کان بج رہے تھے۔

وہ آواز پھر سنائی دی کسی کے پہلو بدلنے کی مدہم آواز۔ کسی کے لباس کی ہلکی سی

باب-۶

بست سی چنگاریاں بے شمار جگنوؤں کی طرح ہلکے سے چٹائے کی آواز کے ساتھ جھونپڑی کی فضا میں بکھر گئیں اور لکڑیوں نے کڑوا اور زرد رنگ کا دھواں اگلدیا۔ جو ڈانٹا کی آنکھوں اور منہ میں جاگسا اس کی آنکھوں میں سے جلن کے ساتھ پانی بہہ آیا اور وہ کھانسنے لگی۔

وہ جھونپڑی کے ایک کونے میں پچھلے کئی منٹوں سے آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ آگ اور روشنی ہو تو اس کی ڈھارس بندھائے لیکن لکڑیاں گیلی تھیں اور جھونپڑی میں ہوا نہ آ رہی تھی کہ انہیں پکھا جھل کر بھڑکا دیتی۔ ڈانٹا تھک کر اکڑوں بیٹھ گئی۔

باہر دن ختم ہو رہا تھا اور روشنی غائب ہو رہی تھی۔ جھونپڑی میں ابھی سے اندھیرا گھس آیا تھا اور ننھے سے الاؤ سے اٹھتا ہوا دھواں اس اندھیرے کو اور بھی گاڑھا کر رہا تھا۔ فضا سرد ہو چلی تھی لیکن ڈانٹا کو گرمی کی اتنی ضرورت نہ تھی۔ جتنی روشنی کی سردی تو بہر حال وہ برداشت کر سکتی تھی، لیکن اندھیرے کو نہیں کیونکہ جیسے جیسے اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اس کے دل میں خوف اترتا جا رہا تھا وہ اندھیرے سے کبھی خوف زدہ نہ ہوئی تھی۔ لیکن یہاں خدا جانے کیا بات تھی کہ وہ اندھیرے سے ڈرنے لگی تھی، اس بچے کی طرح جسے اس کی ماں نے شرارت کی سزا دینے کے لئے یا غلطی سے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا ہو، ڈانٹا کا خوف بڑھتا ہی جا رہا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اندھیرا اترتے ہی کچھ ہوگا۔ شاید تاریکی کے دیوتا اور بلائیں نکل کر اسے نگل لیں گی۔

وہ ایک بار پھر بجھتی ہوئی آگ پر جھک گئی کہ پھونکیں مار مار کر اسے بھڑکا دے

کوٹ ڈریکولا بیدار ہو چکا تھا۔ اور اب وہ اٹھ رہا تھا۔ پاگل کتے کی سی ایک بھیانک چیخ سے نہ خانے کی فضا لرزا ٹھی، یہ چارلس تھا۔ جو چیخا تھا۔ دفعہ اس کے ہر گھٹنوں میں سے کٹ گئے اور وہ دھڑام سے گرا۔ لیکن پھر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں فرش پر ٹیک کر جیسے بڑی تکلیف سے اٹھ کر گھٹنوں کے بیٹھ گیا۔ پھر دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر بڑی کوشش کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ اور لڑکھڑاتے قدموں سے زینہ کی طرف بھاگا۔

اور اب وہ شرابیوں کی طرح جھومتا اور ٹھوکریں کھاتا چکر دار زینہ چڑھ رہا تھا۔



طرف دیکھا، ایک طویل القامت انسانی سایہ دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔

ڈانٹا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

کلیو نے کہا۔ ”خاتون! ایک بار پھر میں نے آپ کو خوفزدہ کر دیا جس کی میں معافی چاہتا ہوں۔“

”کلیو تم؟“

”جی ہاں۔ یہ میں ہی ہوں۔“

”تم..... تم..... یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

”آپ کو لینے آیا ہوں خاتون“

”مجھے!“

”جی ہاں، آپ کے شوہر نے مجھے بھیجا ہے۔“

”چارلس نے؟“

جی ہاں۔ انہوں نے مجھے بلکھی لے کر یہاں بھیجا ہے کہ آپ کو ان کے پاس پہنچا دوں۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ.....“

”آپ کے شوہر سب کچھ سمجھا دیں گے۔“

کلیو ایک بار پھر وہی گزشتہ رات والا کلیو تھا۔ فرماں بردار اور مہمانوں کا احترام کرنے والا۔ وہ جھونپڑی کا ٹوٹا ہوا کواڑ اس طرح پکڑے کھڑا تھا جیسے یہ کسی آرام دہ بیرونی کمرے کا دروازہ ہو جس کے دوسری طرف ایک وسیع و عریض کمرے میں پردے اور بار سوخ ہستی ڈانٹا کی منتظر ہو۔

”لیکن ایلن کہاں ہے؟“ ڈانٹا نے ایک دم سے پوچھا۔ ”کہاں گیا وہ اور اس کی بیوی بھی؟“

بیوی بھی؟“

کچھ تو روشنی ہو۔ اس کے دل سے ذرا سا خوف دور ہو۔

لیکن ابھی وہ جھکی ہی تھی کہ دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی وہ اٹھ کر کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور وہاں جالوں کی جھالیں لٹک رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر جالے گھسٹ لئے اور پھر کھڑکی کے شیشوں پر ہتھیلی پھیر کر اس پر سے چٹنائی کے دھبے مٹائے اور چوراہے کی طرف دیکھا۔

ٹاپوں کی آواز زیادہ سے زیادہ قریب آئی جا رہی تھی..... اور پھر اسے وہ نظر آگئے وہی کالے گھوڑے جو کبھی کو کھینچ رہے تھے گھوڑے وہی تھے جو گزشتہ رات آئے تھے کبھی وہی تھی جس میں گزشتہ رات وہ چاروں سوار ہوئے تھے اور جو انہیں قہر تک لے گئی تھی۔

ڈانٹا نے کھڑکی کے شیشے سے اپنی ناک لگا دی اور غور سے دیکھنے لگی۔

کبھی آگے بڑھی، اس کی زلفاں کم ہونے لگی اور وہ چوراہے پر پہنچ کر رک گئی گھوڑوں نے ایک جھرجھری لے کر اپنے بدن جھٹکے، سر ہلائے اور بے حرکت کھڑے ہو گئے، ڈانٹا ایک طرف کھسک کر کھڑکی کے کنارے پر کھڑی ہو گئی اس زاویے سے اسے پوری کبھی نظر آتی تھی۔

کبھی پر کوئی کوچوان بیٹھا ہوا نہ تھا۔

گھوڑے آپس میں تھو تھنہٹاں رگڑ رہے تھے اور زمین پر ٹاپیں مار رہے تھے وہ خاموش کھڑے تھے اور کبھی بھی منتظر کھڑی تھی، اس کے آتے ہی فضاء پر ہول بن گئی تھی۔ خاموشی اور بھی گہری ہو گئی تھی جیسے عناصر بھی دم بخود اور سسے ہوئے ہوں۔

ڈانٹا کے دل میں ایک عجیب طرح کا خوف بڑھنے اور پھیلنے لگا اور پھر وہ ناقابل برداشت بے چینی میں تبدیل ہو گیا وہ کھڑکی کے قریب سے ہٹ آئی۔

فورا ہی ہلکی سی آواز کے ساتھ جھونپڑی کا دروازہ کھلا ڈانٹا نے چونک کر اس

خندق کے پل پر کے تختے گھوڑوں کی ٹاپوں اور پھر بجھی کے پیوں کی کھڑکڑاہٹ سے بچ اٹھے، اور یہ آواز قصر کی محرابوں میں گھس کر اور آواز بازگشت پیدا کر کے ڈوب گئی۔ بجھی صحن میں پہنچ چکی تھی بجھی ابھی پوری طرح رکی بھی نہ تھی کہ کلیو کوچوان کی نشست پر سے نیچے کود آیا اور اس سے پہلے کہ ڈانٹا ”اتروں یا نہ اتروں“ کا فیصلہ کر پاتی، وہ بجھی کا دروازہ اس کے لئے کھولے منسوب کھڑا تھا۔

”اس طرف خاتون۔“ اس نے کہا۔

اور پھر کمر میں سے اس حد تک جھک گیا، کہ ڈانٹا کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کلیو اس کا مذاق اڑا رہا ہو یا اسے بتا رہا ہو۔

بہر حال وہ بجھی میں سے اتر آئی اور قصر کے صدر دروازے کی طرف چلی، کلیو اس کے پیچھے تھا لیکن جب ڈانٹا نے دروازہ کھولنے کے لئے اپنا ہاتھ لبا کیا تو کلیو اک دم سے اچھل کر اور حیرت انگیز پھرتی سے آگے بڑھ آیا اور اس سے پہلے کہ ڈانٹا کی انگلیوں کی پوریں کواڑ کو چھوتیں کلیو اس کے لئے دروازہ کھول چکا تھا۔

ڈانٹا خاموشی سے آگے بڑھی اور دروازے میں سے گزر کر قصر کے بڑے کمرے میں داخل ہو گئی۔ فوراً ہی دروازہ بڑے زور سے بند کر دیا گیا اس کے بند ہونے کی آواز سے ڈانٹا کا دل قلا بازی سی کھا گیا اور وہ کلیو کو سرزنش کرنے کے لئے اس کی طرف گھوم گئی۔

لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ کلیو قصر کے باہر ہی رہ گیا تھا۔

ڈانٹا ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ دروازے پر جا پڑی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کواڑ پر لگا ہوا پرانی طرز کا دست پکڑ لیا اور اپنے نازک جسم کی پوری طاقت صرف کر کے اسے کھینچا۔ دروازہ مضبوطی سے بند تھا چنانچہ وہ نہ کھلا۔

”کب سے ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔“ ایک آواز نے کہا۔

”میں نے عرض کیا نا خاتون کہ آپ کے شوہر سب کچھ سمجھا دیں گے“ اور وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

ڈانٹا نے سوچا کہ گزشتہ رات کلیو کی مہماں نوازی کسی خاص مقصد کے تحت تھی، اس کا سلوک جو بظاہر بڑا اطمینان بخش اور قابل تعریف تھا، دراصل بڑا ہی عیارانہ تھا اور اس کی شائستگی اور خوش خلقی بڑی ہی گستاخانہ تھی اس شخص پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اسے احساس تھا کہ اسے کیس نہیں جانا ہے۔ اسے وہیں رہنا ہے، جہاں وہ اس وقت ہے لیکن..... لیکن..... چارلس قصر میں تھا۔ اور اس کلیو کو بھیج دیا تھا کہ وہ ڈانٹا کو لے آئے اور.....“

”خاتون! پہلئے۔ آپ کے شوہر فخر ہیں۔“ کلیو نے کہا۔

اور وہ بے اختیار دروازے کی طرف بڑھی جیسے وہ اپنی مرضی کی مالک نہ رہی ہو۔ کلیو ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور جب ڈانٹا اس کے قریب سے گزری تو وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔

”وہ بجھی میں سوار ہو گئی۔ کلیو خاموشی سے کوچوان کی جگہ جا بیٹھا اور اس نے لگائیں اپنے ہاتھوں میں لے کر گھوڑوں کا رخ موڑ دیا اور ایک بار پھر بجھی اس راستہ پر چل پڑی جو قصر ڈریکولا کی طرف جاتا تھا، ڈانٹا کو کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ اس جنگل میں اور پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوئے قصر ڈریکولا میں کوئی خاص بات تھی۔ کوئی آسیب تھا۔

بجھی بے حد عمدہ اور آرام دہ تھی اور اس دفعہ اس کی رفتار بھی مناسب تھی گزشتہ رات کی بہ نسبت بے حد کم رفتار تھی۔ ڈانٹا کو بڑی عزت و احترام سے اسی گھر کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ جہاں صرف چوبیس گھنٹوں پہلے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا گیا تھا۔

ہیلن ہمیشہ سے مغرور اور خود پسند عورت تھی اور اکثر دفعہ اس کے بشرے سے اسکول کی اساتذہ کی سی حماكت مٹکنے لگتی تھی ڈائنا نے اکثر ہیلن کے بشرے پر یہ حماكت اور كرتخلی ديكھی تھی لیكن اس وقت اس کے بشرے سے جو جذبات عیاں تھے وہ بالكل نئے تھے۔ كم سے كم ڈائنا ان سے واقف نہ تھی۔ كینہ اس کے چرے پر جیسے موجد ہو كر رہ گیا تھا، اس كی آنكھوں میں عجیب سی چمك تھی۔ عیارانہ چمك جس سے شیطانیت جھانك رہی تھی ہو اس ناگن كی طر ح نظر آ رہی تھی، جو پھن پھیلا چکی ہو اور كوئی دم میں ڈسنے والی ہو۔

”معاملہ كچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ ڈائنا نے کہا= ”كچھ گڑ بڑ ضرور ہے۔

كچھ..... ہیلن! ایلن کہاں ہے؟“

”گھبراؤ نہیں۔ آؤ۔ میرے قریب آؤ۔ میری اچھی مہن آؤ۔“

اور ہیلن نے اپنا ایک ہاتھ اس كی طرف بڑھا دیا۔ ڈائنا ایک دم سے پیچھے ہٹ گئی۔

”چارلس کہاں ہے؟“ ڈائنا نے پوچھا۔

”چارلس! آ۔ ہاں..... اب اس سے تمہیں کیا واسطہ؟“

ڈائنا نے كوشش كی كہ اپنے بشرے سے ان جذبات كا اظہار نہ ہونے دے جنہوں نے اس كی دل میں ایک طوفان اٹھا ركھا تھا۔ اسے شدت سے احساس تھا، اور وہ جانتی تھی كہ وہ جو اس كے سامنے كھڑی ہوئی ہے ایلن كی بیوی نہیں ہے۔ وہ ہیلن نہ تھی جس سے ڈائنا واقف تھی۔ وہ دھتتا ”بدل گئی تھی..... وہ..... وہ كچھ اور بن گئی تھی چنانچہ اس كے قریب جانا خطرناك تھا، اس كمرے میں ٹھہرنا خطرناك تھا۔

ڈائنا نے نظروں سے اپنا اور ہیلن كا درمیانی فاصلہ ناپا اور پھر پلٹ كر بھاگ پڑی۔ ایک بھیانك اور وحشت انگیز ققمہ كمرے میں گونج گیا یہ ہیلن تھی جو دیوانوں

یہ پرسكون آواز تھی۔ لہجہ ایسا تھا جیسے بچوں كو ہلانے اور پھسلانے كے لئے بزرگ استعمال كرتے ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ كہ یہ آواز ڈائنا كے لئے انجانى نہ تھی۔

”ہم سوچ رہے تھے كہ تم آؤ گی بھی یا نہیں۔ بہت انتظار كروایا۔“ اس آواز نے کہا۔

ڈائنا آواز كے طرف گھوم گئی۔

زینے كے قریب كوئی اور نہیں بلکہ خود ہیلن كھڑی ہوئی تھی۔ اس نے شب خوابی كا لباس پہن ركھا تھا اور اس كے چمكدار ریشمی بال اس بری طر ح سے كھمرے ہوئے تھے كہ معلوم ہوتا تھا اسے ابھی چند منٹوں پیشتر ہی كمری نیند سے جبراً بیدار كیا گیا ہو۔ ہیلن فطرتاً تند خو اور سخت قسم كی عورت تھی۔ لیكن خدا جانے کیا بات تھی كہ اس وقت اس كے یہ جذبات اس كے بشرے سے اس طر ح نمایاں تھے كہ اس كا چہرہ بگڑ كر بھیانك بن گیا تھا اور وہ بڑی ہی بیدرد اور ظالم نظر آتی تھی۔

لیكن اس كی آواز..... وہ بڑی معصوم تھی اور پھسلانے والی۔

”ڈائنا! بڑی راہ دکھائی تم نے۔“ وہ بولی۔

ڈائنا نے اطمینان كا طویل سانس لیا۔ اس كی ساری پریشانی اور خوف دھتتا ”دور ہو گیا۔ یكایك اس كے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور وہ عجیب طر ح كی نقابت محسوس كرنے لگی۔ تاہم اس كی جی چاہ رہا تھا۔ كہ وہ خوب ہنسے اور وہ بیوقوفوں كی طر ح ہنس كر ہیلن كی طرف بڑھی۔

”چارلس کہاں ہے؟“ اس نے کہا بے حد متفكر اور پریشان تھے ہم۔ سمجھ میں ہی نہیں آتا كہ.....“

ڈائنا جملہ پورا نہ كر سکی۔ اس كی آواز حلق میں ہی ڈوب كر رہ گئی۔

ہیلن نے جس فوری طور سے ہنسا شروع کیا تھا اس فوری طور سے وہ خاموش ہو گئی اور پہلو کے اس دروازہ کی طرف بھاگی جس دروازے سے چارلس نکل آیا تھا۔ اس نے چارلس کے قریب پہنچ کر اس کا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔

”چارلس! میرے بھائی!“ لاؤ میں تمہیں چوم لوں۔“ ہیلن نے کہا۔

چارلس ہیلن کی طرف نہیں بلکہ اپنی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ تو ہیلن اس سے لپٹ گئی۔ ادھر ڈریکولا ڈانٹا کو اپنی گرفت میں لئے تھا اور خود ڈانٹا اپنی آپ کو چھڑانے کے لئے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔

ہیلن نے اپنا سر چارلس کے ماتھے یا رخسار کی طرف جھکانے کے بجائے یہ کیا کہ اپنی گردن ذرا ٹیڑھی کر لی اور اب اس کا سر آہستہ آہستہ چارلس کی گردن پر جھکنے لگا۔ لیکن اس کا یہ عمل کچھ ایسا عیارانہ اور حیوانی سا تھا کہ چارلس ایک دم سے چونکا اور اس نے گھوم کر ہیلن کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ اس کے بشرے سے عجیب طرح کی خونخواری عیاں تھی اور اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ کھل رہے تھے اور اس کے دو کیلے اور لالہ دانت نمودار ہو رہے تھے۔

کچھ اور تو چارلس کی سمجھ میں نہ آیا۔ البتہ اس نے ہیلن کو ایک دھکا دے دیا وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی اور پھر فرش پر گری۔

ادھر ڈانٹا نے ایک آخری کوشش کی اور زور مار کر ڈریکولا کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔ موخر الذکر نے اپنے لالہ اور پتلے ہاتھ اس کی طرف چلائے تو وہ چارلس کی طرف بھاگی۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ اپنے شوہر کے سینے سے لگ جائے اور اس کی بانہوں میں اس وقت تک سمٹی رہے جب تک کہ یہ بھیاں خواب پرستان غائب نہ ہو جاتا، کیونکہ جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ ڈانٹا کے لئے حقیقت سے زیادہ ایک خواب پریشان ہی تھا، لیکن بجائے اس کے کہ چارلس اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتا۔ اس نے ڈانٹا

کی طرح قہقہے لگا رہی تھی اور اس کے یہ کھوکھلے اور غیر ارضی قہقہے ڈانٹا کا خون منجمد کر رہے تھے۔

دروازہ کھلا تھا، ڈانٹا اس کی طرف یوں بھاگی جیسے اس کے پیچھے دوزخ کی عفریت لگ گئی ہوں وہ دروازے کے قریب پہنچ گئی اور۔۔۔ ایک کالے سائے نے اس کا راستہ روک لیا ایک طویل القامت اور دلا پتلا شخص، جس نے سیاہ لبادہ پہن رکھا تھا جس پر سرخ دھاریاں تھیں بڑی پھرتی مگر ایک رقصہ کی سی ادا سے یا اس نازک مزاج قاتل کی طرح جو اپنا شکار منتخب کر رہا ہو اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

ہیلن بدستور قہقہے لگا رہی تھی۔

ڈانٹا کا راستہ روک کر کھڑے ہوئے شخص کا لبادہ اس کے پیچھے یوں اڑ رہا تھا کہ وہ کسی بڑی سی چمکاوڑ کے دو بازو معلوم ہوتے تھے دوپتلے اور لالے ہاتھ ڈانٹا کی طرف بڑھے اور شکاری پرندے کے سے پنجوں نے اسے دبوچ لیا۔

ڈانٹا کو دبوچنے والے کا چہرہ کسی مردے کا چہرہ تھا سا ہوا بے رنگ اور کرخت اور ڈانٹا اس چہرے پر اندھا دھند گھونے چلا رہی تھی لیکن ان گھونٹوں کا اس کا میاب شکاری پر کچھ بھی اثر نہ ہوا، حتیٰ کہ اس نے پلک تک نہ جھپکی اور اس کی گرفت ذرا بھی ڈھیلی نہ ہوئی۔ اس نے ڈانٹا کو بڑی آسانی سے گھسیٹ کر قدرے اوپر اٹھالیا۔ اس کے پیر فرش سے اوپر اٹھ گئے۔ اور اب وہ ڈانٹا کو کچھ گھسیٹتے ہوئے اور کچھ اٹھائے ہوئے زینے کی طرف چلا۔

”ڈریکولا!“ چھوڑ دو اس لڑکی کو۔“

اور ڈانٹا خوشی سے رو پڑی۔ اس کے منہ سے ہلکی نکل گئی، کیونکہ یہ کسی اور کی نہیں بلکہ اس کے اپنے چارلس کی آواز تھی۔ وہ بدقت تمام ایک طرف گھوم گئی کہ اپنے چارلس کو دیکھ سکے۔

کو پکڑ کر اپنے پیچھے ڈھکیل دیا اور ڈریکولا کے چہرے پر اپنی نظریں بدستور جمائے رکھیں۔

”ڈائنا فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔“ چارلس نے کہا۔
”نہیں۔“

• ”جاؤ۔“ کبھی میں سوار ہو کر بھاگ نکلو۔“

”نہیں۔ میں تم کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

”جیسا میں کہتا ہوں، ایسا ہی کرو۔ ڈائنا! جاؤ۔“

ڈریکولا ان کی طرف بڑھا۔ وہ ذرا بھی پریشان اور گھبرایا ہوا نہ تھا اس کے برخلاف وہ مطمئن تھا۔ اس بلی کی طرح جس نے دو چوہے دیوچ رکھے ہوں، وہ احتیاط سے کانپ رہا تھا اگر ایک شکار فرار ہو گیا تو دوسرا نہ بچ سکے گا۔ وہ آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا۔ بشرطیکہ ہم اسے مسکراہٹ کہہ سکیں کیونکہ اس کے ہونٹوں کا یہ کھنچاؤ بڑا ہی لرزہ خیز تھا۔

ڈائنا جانے کے لئے تیار نہ تھی، لیکن چارلس نے اپنا ایک ہاتھ خاموشی سے دروازہ کی طرف اٹھا دیا۔ اور ڈائنا بڑی فرمانبرداری سے دروازے کی طرف پلٹ گئی اس کے اور دروازے کے درمیان اس بڑے کمرے کی وسعت تھی جو ڈائنا کو ایک وسیع اور افق تک پھیلے ہوئے میدان کی طرح معلوم ہو رہی تھی اور اس وسعت میں کہیں کوئی جائے پناہ نہ تھی۔
وہ دروازے کی طرف بھاگی۔

فوراً ہی ہیلن کا خون منجمد کر دینے والا قلعہ گونج گیا ہیلن نے ڈائنا کا ایک بازو پکڑ لیا۔ آہنی گرفت تھی اس کی، اس نے ڈائنا کو بڑی بیدردی سے پیچھے کی طرف دھکیلا اور دیوار تک دھکیلتی چلی گئی اور اب ڈائنا کی پیٹھ سے دیوار سے لگ چکی تھی اور

ہیلن اسے دیوچے ہوئے تھی۔

اور ڈریکولا چارلس کے قریب پہنچ گیا۔

چارلس نے اس کی طرف گھونٹہ چلا دیا۔ ڈریکولا نے ایک طرف ہٹ کر اس کا وار چلایا اور پھر اپنا سر جھکا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے چارلس کی کمر پکڑی اور اسے بڑی آسانی سے، جیسے وہ ایک ڈیڑھ برس کا بچہ ہو اور اٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ چارلس کچھ کر سکتا ڈریکولا نے اسے اچھال کر پھینک دیا۔ چارلس ہوا میں تیرتا ہوا سامنے والی دیوار سے بڑی زور سے ٹکرا گیا اس کا بھیجاہل گیا، نظر کے سامنے رنگ برنگ بلبلے سے بناج گئے اور پھر وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ڈریکولا کے منہ سے بھیڑیے کی غراہٹ کی سی آواز نکلی اور وہ چارلس کی طرف بڑھا۔

چارلس نے اپنا سر جھکا، دونوں ہاتھ گھٹنوں پر ٹیکے اور دیوار سے پیٹھ لگائے بلکہ یوں کہیں کہ دیوار پر پیٹھ گھسیتا آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور کسی ہتھیار کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

چند فٹ دور ایک زنگ آلود تلوار پڑی ہوئی تھی ایک سیکنڈ پہلے یہ تلوار دیوار پر تکی ہوئی تھی لیکن چارلس دیوار سے اس زور سے ٹکرایا تھا کہ وہ کیل میں سے نکل کر فرش پر آگری تھی، چارلس اپنے پہلو پر لڑھک گیا اور ہاتھ بڑھا کر تلوار کا دستہ پکڑ لیا، وہ جلدی سے اٹھا اپنی ٹانگیں ذرا چوڑی کر لیں کہ توازن برقرار رہے اور اب وہ خطر کھڑا تھا تلوار کی نوک آگے بڑھتے ہوئے ڈریکولا کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

ڈائنا ہیلن کی گرفت سے آزاد ہونے کی دیوانہ وار کوشش کر رہی تھی لیکن ہیلن اسے برابر دیوچے جارہی تھی اور پھر دونوں عورتیں لمحے بھر بعد چارلس اور ڈریکولا کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

دو دونوں کی ٹکر ہونے والی تھی۔

چارلس نے کچپا تلواریں ڈریکولا کی طرف جھونک دی سرخ دھاریوں والا کالبارہ کسی بڑے سے پرندے کے باؤنوں کی طرح پھڑپھڑایا۔ اور اس نے فضا میں ایک کالا بخور سا پیدا کر دیا۔ ڈریکولا وار بچا گیا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ وہ تلواریں کا پھل بھی اپنے ہاتھ میں پکڑ چکا تھا۔ چارلس نے تلواریں کو گھما کر گھینے کی کوشش کی، تاکہ گرفت سے چھڑا کر دو سر اور بھرپور وار کر دے۔



چارلس زور آزمائی کر رہا تھا اور تلواریں ڈریکولا کی ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تلواریں کا پھل ڈریکولا کے ہاتھ میں گھوم رہا تھا اور اس کی 'ڈریکولا کی' انگلیوں کے درمیان سے خون ٹپک رہا تھا، تلواریں کی دھار ڈریکولا کی ہتھیلی میں ہڈی تک پہنچنے کے لئے راستہ بنا رہی تھی لیکن خود ڈریکولا مسکرا رہا تھا۔

اس نے ایک زور کا جھٹکا دیا اور تلواریں چارلس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

ڈریکولا کے منہ سے ایک بار پھر غراہٹ کی آواز نکلی اس نے تلواریں دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اوپر اٹھائی اور پھر "تراج" سے یوں توڑ دی جیسے وہ فولادی تلواریں نہیں بلکہ خشک مٹی ہو۔ اس نے تلواریں کے دونوں ٹکڑے اپنے قدموں میں پھینک دیئے اور اب اس نے بڑے یقین سے، بڑے اطمینان سے اور قہمندانہ غراہٹ کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ چارلس کی طرف بڑھائے اور دوسرے ہی لمحے اس کی گردن ڈریکولا کے بیدار اور خونخوار پنجوں میں پھنسی ہوئی تھی ڈریکولا اس کا گلا دبائے لگا۔

چارلس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور جھک گیا اور آہستہ آہستہ بیٹھے لگا لول تو اس لئے کہ ڈریکولا کا تمام بوجھ اس پر پڑ رہا تھا اور دوم اس لئے کہ اس کا دم گھٹ رہا تھا اور وہ مر رہا تھا۔

ڈاکٹر کی خشک شکاف جیج سے قمر کی بے حس دیواریں کانپ گئیں وہ بیلن کی

آجائے۔ لیکن وہ ہوا میں ادھر ادھر لہرا کر رہ جاتے تھے۔
ڈریکولا مسکرا رہا تھا اس کے ہونٹ دانتوں پر کھینچ گئے تھے۔ آنکھوں میں سرخ
موٹے ڈورے پیدا ہو گئے تھے۔ اور وہ اس بلی کی طرح ہولے ہولے غرا رہا تھا جو اپنے
ڈکار سے کھیل رہی ہو۔

”چارلس۔۔۔ صلیب“ ڈائنا چیخی۔
ڈریکولا چارلس کو جھنجھوڑ رہا تھا۔
”چارلس۔ صلیب بناؤ۔“

اور وہ ڈریکولا اور چارلس کی طرف بڑھی لیکن چارلس نے نہ صرف اس کی آواز
سن لی تھی بلکہ وہ اس کا مطلب بھی سمجھ گیا تھا وہ ایک طرف اس طرح جھک گیا کہ
اس کا پورا بوجھ ڈریکولا کے ہاتھوں پر آ پڑا۔ کچھ جھک کر اور کچھ لٹک کا اس نے فرش
پر سے ٹکوار کے دونوں ٹکڑے اٹھا لئے جو وہاں ڈریکولا نے پھینکے تھے اس کی آنکھوں
کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ دم گھٹ رہا تھا۔ اعضا بے جان سے ہو چلے تھے اور
اس کے باوجود اس نے ٹکوار کے ایک ٹکڑے پر دو سرا ٹکڑا اس طرح رکھ دیا کہ ان دو
ٹکڑوں نے صلیب کی ایک بے ڈھنگی سی شکل بنا دی۔

اس کے بعد چارلس بدقت تمام سیدھا ہوا اور اپنی بے جان ہوتی ہوئی ٹانگوں پر
اپنے جسم کا بوجھ سنبھال کر اس نے صلیب آہستہ آہستہ بلند کی۔
اور اب صلیب عین ڈریکولا کے سامنے تھی۔

ڈریکولا کی فتمندانہ اور خواب ناک سی مسکراہٹ یکایک غصے کی غراہٹ میں
تبدیل ہو گئی۔ اس نے چارلس کو چھوڑ دیا اور گھبرا کر بے اختیار کئی قدم پیچھے ہٹ
گیا۔

ڈریکولا غصے اور احساس شکست سے پھنکار رہا تھا۔

گرفت سے آزاد ہونے کے لئے کسی پاگل عورت کی طرح جدوجہد کر رہی تھی۔ ہیلن
اور ڈائنا آپس میں ستم گتھا تھیں۔ یونہی کشتی کرتے اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی
کوشش کرتیں ہوتیں وہ دونوں کمرے کے عین بیچ میں آگئیں اس جدوجہد میں ڈائنا
کے لباس کی ایک آستین پھٹ گئی اور گریبان کے بٹن کچھ ٹوٹ گئے اور کچھ کھل گئے
اور اس کا سینہ چھاتیوں کی اوپری گولائیوں تک عیاں ہو گیا چنانچہ کھلے ہوئے گریبان
میں سے وہ سیاہ ربڑی دھاگا کے نچلے سرے سے ایک چھوٹی اور سنہری صلیب لٹک
رہی تھی۔ یہ صلیب اور اس کی مرحوم ماں کی نشانی تھی۔ دھاگے کے سرے پر جھولتی
ہوئی صلیب گھڑی بھر کے لئے ہیلن کے ہاتھ سے چھو گئی۔

ایک بھیاںک خون منجمد کر دینے والی چیخ مچ گئی اس دفعہ یہ ہیلن تھی جو چیخی تھی
اس نے ڈائنا کو گھبرا کر چھوڑ دیا اور لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ہیلن کی آنکھیں
جیسے تکلیف سے پھٹ گئی تھیں، اس کا منہ کھلا تھا اور وہ بری طرح سے ہانپ رہی
تھی۔

ڈائنا بھی لڑکھڑا گئی وہ بھی منہ کھولے کمرے کمرے سانس لے رہی تھی اور یہ
سوچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ ایک دم سے کیا ہوا۔ کہ ہیلن یوں چیخ پڑی جیسے
کسی نے اس کی ہتھیلی پر دھککا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو۔؟

اس نے کیوں گھبرا کر ڈائنا کو چھوڑ دیا؟ اور پھر اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔
اس نے وہ چھوٹی سی سنہری صلیب دو انگلیوں میں پکڑ کر اوپر اٹھائی۔
فوراً ہیلن خوف سے غرا کر پیچھے ہٹ گئی۔
”چارلس۔!“ ڈائنا نے کہا۔

چارلس کی آنکھیں حلقوں میں سے نکل پڑی تھیں اس کے دونوں ہاتھ تقریباً
بے جان سے ہوا میں ہل رہے تھے، کہ شاید ان کی گرفت میں کوئی چیز، کوئی ہتھیار

تھے۔ کیونکہ وزنی بکھی بھی ان کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہی تھی۔
 اور پھر اچانک چوراہا سامنے نمودار ہو گیا۔ چارلس نے اپنے جسم کی پوری قوت
 صرف کر کے لگائیں کھینچ لیں۔ وہ گھوڑوں کو جوزف باد کی طرف موڑ رہا تھا۔
 لگاموں کے کھنچاؤ سے مجبور ہو کر اور دھول کا ایک بادل سا اڑا کر گھوڑے تو مڑ گئے
 لیکن بکھی نہ مڑی۔ جس نشست پر ڈانٹا بیٹھی ہوئی تھی اس کے عین نیچے سے تڑانے
 کی آواز سنائی دی اور ڈانٹا کو کچھ دھندلا سا احساس ہوا کہ بکھی کا ایک ٹوٹا ہوا پیسہ اپنی
 جگہ سے الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے کنارے تک چلا گیا۔ ایک لمحے تک وہ کہیں
 گرتی رہی۔ ایک لمحے تک جو اسے خوفناک حد تک طویل معلوم ہوا۔ وہ آسمان اور
 زمین کے درمیان معلق رہی اور پھر زمین اور بکھی کے نچلے حصے کی ٹکر ہو گئی۔
 ”خر۔ خر“ کی آواز بلند ہوئی، بکھی زمین پر جھک گئی۔ ایک اور تڑانہ سنائی دیا اور
 ڈانٹا نشست پر سے لڑھک گئی۔

جیسے زمین و آسمان نے جگہ بدل لی، پوری دنیا گھوم گئی، ڈانٹا نے اپنے دونوں ہاتھ
 چلائے کہ اس چیز کا سارا لے لے جو وہاں نہ تھی، ایک اندھیرا تھا جس میں بھنور سے
 پڑ رہے تھے۔

اور پھر وہ گری۔۔۔ چت گری سر سے لے کر ایزبوں تک جیسے کسی نے ایک تختہ پر
 جڑوا ہو، ایک زوردار اور عظیم ضرب جس سے اس کی ریڑھ کی ہڈی چرچرا اٹھی۔
 اور پھر مہیب اندھیرے نے اسے اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ پھر کچھ نہ تھا۔ سب کچھ
 کم تھا۔۔۔ حواس بھی اور قیاس بھی۔

لہر کھڑاتی ہوئی بکھی خندق کے چوٹی پر سے ایک طوفان کی طرح گزر گئی چارلس
 بڑی بیدردی سے گھوڑوں پر چابک برسا رہا تھا۔ اس پر جیسے بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ڈانٹا
 نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی اسے کچھ کہا قعر ڈریکولا خطرناک تھا،
 پر اسرار تھا اور وہ اس سے جلد از جلد بہت دور پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ
 چارلس گھوڑوں کو یوں بے تحاشہ اس لئے بھگا رہا تھا کہ وہ بھی حد سے زیادہ خوفزدہ
 تھا۔۔۔ ڈانٹا کو احساس تھا اور وہ جانتی تھی کہ چارلس کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ
 ڈریکولا انسان نہ تھا بلکہ کچھ اور تھا کیا تھا؟ اس کا جواب انہیں فی الحال نہ ملا تاہم اتنا تو
 انہیں معلوم ہی ہو چکا تھا کہ وہ عجیب اور مافوق الفطرت قوتوں کا مالک تھا اور یہ کہ اگر
 انہوں نے ذرا بھی سستی کا ثبوت دیا، گھوڑوں پر ذرا بھی رحم کیا تو ڈریکولا اپنی قوتوں
 کے زور سے انہیں واپس قعر کی طرف نہ صرف موڑ دے گا بلکہ انہیں اس طرف بلا
 بھی لے گا اور پھر۔۔۔ خدا جانے کیا۔

رفار کم کئے بغیر بکھی موڑ مڑ گئی اور اس کے پیچھے جیسے احتجاجا جھٹٹے بکھی کسی
 جاندار کی طرح اچھل کود کر رہی تھی۔ جیسے اپنی سواریوں کو پھینک دینا چاہتی ہو۔ ڈانٹا
 کرنے سے بچنے کے لئے چارلس سے لپٹ گئی۔

”سڑاک۔ سڑاک“ چابک گھوڑوں پر برس پڑا اور وہ گردن توڑ تیزی سے وہ
 طویل ڈھلان اترنے لگے جو چوراہے تک جاتی تھی۔ بکھی ان کے پیچھے بھاگی آ رہی
 تھی۔

ڈھلان عمودی ہو گئی۔

اور اب چارلس کو ہوش آیا اور اسے احساس ہوا کہ لگائیں کھینچنے کا وقت آ گیا
 تھا۔ لیکن اب وہ وقت نکل چکا تھا۔ اسے بہت دیر کے بعد خیال آیا تھا وحشت زدہ
 گھوڑوں کو اب قابو میں لینا ممکن نہ تھا۔ خود گھوڑے بھی اپنے آپ کو نہ روک سکتے

تھی۔ اس نے دیکھا کہ کبھی ٹوٹ چکی ہے لیکن ڈائنا اس سے لپٹی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ گھسیٹ رہی ہے اور گھوڑے اس ٹوٹی ہوئی کبھی اور ڈائنا کو گھسیٹتے ہوئے قصر ڈریکولا کی طرف لئے جارہے ہیں۔ اور وہاں وہ دونوں منتظر کھڑے ہوئے ہیں۔ وہی عفریت ڈریکولا اور وہی ڈائن ہیلن۔

چارلس کانپ گیا اور پھر اسے ڈائنا نظر آگئی۔

وہ چند گز کے فاصلے پر بے حس و حرکت ایک ڈیمیر کی طرح پڑی ہوئی تھی چارلس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی اور اس کا ماتھا سرد ہو گیا۔ اپنی چیخ کو گلے میں ہی روک کر وہ ڈائنا کی طرف دوڑ پڑا۔ گرا اٹھا اور پھر اس کی طرف دوڑا جیسے جیسے وہ اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا اس کے دلمیں بھیانک اندیشوں کا جھوم بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اس نے اوندھے منہ پڑی ہوئی ڈائنا کو لڑکھا کر چیت لٹا دیا۔

اس کے بالوں کے نیچے سے خون کی ایک باریک سی لکیر نکل آئی تھی اور خود ڈائنا کا رنگ ناقابل یقین حد تک زرد تھا۔ اب یہ کہنا مشکل تھا کہ اس کا رنگ واقعی ایسا مردہ کا سا ہو گیا تھا یا پھر وہ زرد اور مردہ چاندنی کی وجہ سے اسی معلوم ہو رہی تھی۔ بعض اوقات چاندنی عجب کھیل کھیل کر نظر کو دھوکہ دے جاتی ہے اور خون کی وہ لکیر..... وہ بھی ایک معمولی سی سیاہ لکیر معلوم ہو رہی تھی۔

وہ اس کے اوپر جھکا اس کا نام پکارتا رہا لیکن وہ بیدار نہ ہوئی۔ بیدار ہونا تو دور کی بات ہے اس نے حرکت تک نہ کی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ ڈائنا کے سینے پر رکھ دیا۔ اس کا تنفس چل رہا تھا۔ چارلس کو یقین ہو گیا کہ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ زندہ تھی اور..... اور..... اس نے موہوم سی حرکت بھی کی تھی۔ لیکن چارلس کا سر گھوم رہا تھا جسے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا اور اس کے ہاتھ کانپ رہے

رات کو سیاہ ہونا چاہئے تھا وہ سرخ تھی۔ خون کی طرح سرخ، وہ اندھیرا نہ تھا۔ سیاہی مائل سرخی۔ چارلس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو یہ سرخی پکھل کر مختلف اور شوخ رنگوں کی روشنی میں تبدیل ہو گئی اور اتنی تیز تھی یہ روشنی کہ چارلس کی آنکھوں میں چھ رہی تھی۔ حقیقت میں بے شمار سویلوں کی طرح چھ رہی تھی اور وہ اس کی چھین محسوس کر رہا تھا۔

اور پھر چارلس نے اپنے نیچے کوئی نرم اور نرم سی چیز محسوس کی۔ گھاس نرم نرم گھاس۔ وہ شاید زمین پر پڑا ہوا تھا جہاں گھاس اگ رہی تھی لیکن زمین گول گول گھوم رہی تھی۔ چرخی کی طرح بس گھوم رہی تھی۔ چارلس نے گھومتی ہوئی دنیا پر اپنے آپ کو ٹکا رکھنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ نیچے ٹیک کر آنکھیں کھول دیں اور چند ہیا دینے والی روشنی کے الجھڑے دیکھنے لگا۔

رفتہ رفتہ روشنی کی رنگین دھبیاں مدھم ہو کر فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ کوئی الو اپنی منخوس آواز میں چیخ رہا تھا، ہوا درختوں کے پتوں اور ٹہنیوں سے لپٹ کر سسکیاں بھر رہی تھی اور بادل کے ایک ٹکڑے کے کنارے میں سے چاندنی کی شعاعیں پھوٹ کر آسمان پر پھیلنے لگی تھیں۔

وہ بدقت تمام اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس پر اسرار کبھی کا کیس پتہ نہ تھا جس میں سوار ہو کر وہ ڈائنا قصر ڈریکولا سے فرار ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے گھوڑے اسے گھسیٹ کر لئے گئے تھے اور کیس آگے جا کر وہ یا تو الٹ گئی تھی یا ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

لیکن ڈائنا..... ڈائنا کہاں تھی؟

اس سوال کے جواب میں اس کے تصور نے جو تصویر دکھائی وہ بڑی ہی لرزہ خیز

دی تین کیلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ چنانچہ بے حد نزدیک اس کے باوجود بے حد دور راستہ سیدھا اور صاف تھا لیکن اس کے لئے بہت طویل اور مشکل تھا۔

وہ جنگل میں گھس پڑا۔ یہاں وہ ایک حد تک محفوظ تھا۔ اپنی بیوی کا بوجھ بچالے وہ بڑی احتیاط سے چل رہا تھا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ اگر کوئی انہیں تلاش کر رہا ہو تو ان آوازوں سے ان کا پتہ معلوم نہ کر لے۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود خشک پتے ان کے قدموں تلے چرمارہے تھے اور خشک ٹھنیاں چٹانوں کی آواز کے ساتھ ٹوٹ رہی تھیں اور یہ چٹانے چارلس کو دھماکے معلوم ہو رہے تھے۔ جھاڑیاں اس کے کٹ سے لپٹ لپٹ جاتی تھیں اور جب وہ آگے بڑھ جاتا تھا تو وہ اس کا دامن چھوڑ کر بڑے زور سے درختوں کے تنوں سے ٹکرا جاتی تھیں۔

چارلس آگے بڑھتا رہا لیکن اس کا ہر قدم یوں اٹھ رہا تھا جیسے وہ چٹنی اور گھٹنوں تک گہری کچھ میں چل رہا ہو درختوں کی لٹکتی ہوئی ٹھنیاں اس کے چہرے سے ٹکراتی رہیں۔ اس کی آنکھیں جھپک کر بند ہو جاتیں اور پھر فوراً ہی کوئی شنی چابک کی طرح اس کے رخسار پر پڑتی۔ یہ تو خیر رات کا وقت تھا لیکن دن کے وقت بھی اس جنگل میں چلنا مشکل ہوتا کیونکہ ہر درخت سے بیلبل لپٹ رہی تھیں، مٹی برابر جگہ بھی خالی نہ تھی، ہر جگہ مختلف قسم کی خاردار چھاڑیاں آگ رہی تھیں اور درخت یوں ملے کھڑے تھے جیسے سر سے سر جوڑے سرگوشیاں کر رہے ہوں۔

اس کا سانس پھول گیا تھا اور اس کے حلق سے سیٹیوں کی آواز کے ساتھ نکل رہا تھا۔ کئی منٹوں تک وہ ڈانٹا کا نام بڑبڑاتا رہا۔ اسے تسلی دیتا رہا، دعائیں مانگتا رہا اور اس کی امیدیں بندھاتا رہا لیکن ڈانٹا کچھ سن نہ رہی تھی اور یہ وہ خود بھی جانتا تھا چنانچہ یہ الفاظ وہ خود اپنی ڈھارس کے لئے بڑبڑاتا رہا تھا۔ لیکن پھر وہ یہ بھی نہ کر سکا۔ اس کی آواز خود بخود ڈوب گئی اور لفظوں نے دم توڑ دیا۔

تھے۔ اس حالت میں وہ کوئی بھی بات یقین سے کیسے کہہ سکتا تھا؟۔ خود اس کی حالت غیر ہو رہی تھی پھر وہ کیسے معلوم کر سکتا تھا کہ ڈانٹا زندہ تھی یا۔۔۔؟

بیہوش یا شاید مرہ ڈانٹا کو اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں پر اٹھالیا۔ اور آج پہلی دفعہ وہ ڈانٹا کا بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ شادی کی پہلی رات کو وہ ڈانٹا کو اس طرح اٹھا کر عجلہ عروسی میں داخل ہوا تھا اور اس وقت اس نے اس کا بوجھ محسوس نہ کیا تھا۔

اس کے پیر من من بھر کے ہو رہے تھے اور وہ ہر قدم بڑی کوششوں کے بعد اٹھا سکتا تھا۔ تاہم وہ ڈانٹا کو اٹھائے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ کسی طرف جا رہا تھا لیکن کوئی آواز اس کے دل میں کہہ رہی تھی کہ چوراہے کے قریب ٹھہرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کی چھٹی حس اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد اس چوراہے سے دور چلا جائے اور اس سے پہلے کہ قعر ڈریکولا کی وہ دو عفریت۔۔۔۔۔ ڈریکولا اور ہیلن۔۔۔۔۔ ان کے تعاقب میں نکل پڑیں وہ کسی محفوظ جگہ پہنچ جائے۔۔۔۔۔ وہ ڈریکولا کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ اسے شکست نہ دے سکتا تھا۔ چنانچہ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ وہ فرار ہو جائے اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ ڈریکولا اور ہیلن اسے اور ڈانٹا کو تلاش کرنے میں ناکام رہیں۔

چنانچہ وہ کسی طرف جاتا اس سے کوئی فرق نہ پڑ جانے والا تھا۔ اس کے لئے چاروں سمتیں برابر تھیں کچھ دور آگے بڑھنے کے بعد وہ رک گیا اور سوچنے لگا کہ کسی طرف چلا جائے۔ جوزف باد ٹھیک رہے گا۔ وہاں کے لوگ تو ہم پرست تھے۔ تاہم وہیں جانا مناسب ہو گا۔ جس راستے سے وہ اس طرف آئے تھے وہ بے حد طویل راستہ تھا اور آبادی بہت دور تھی چنانچہ صرف جوزف باد کچھ قریب تھا حالانکہ اس حالت میں وہاں تک بھی پہنچنا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ چارلس کو یاد آیا کہ جوزف آباد

اور کوئی آواز اس کے دل میں کہہ رہی تھی کہ اسے اپنی شکست قبول نہیں کرنی ہے۔ اس نے اپنا سر اٹھایا۔ ڈانٹا ایک زرد ڈھیر کی طرح پڑی ہوئی تھی درختوں کے پتوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی چاندنی کے گول داغ اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ مافوق البشرانہ قوت اور کوشش سے کام لے کر وہ ان کی طرف بیٹھنے لگا۔

وہ ڈانٹا کے قریب لیٹ گیا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بدستور زرد تھا۔ زردی اس کے بشرے پر جیسے منجمد ہو کر رہ گئی تھی اور اس کے ماتھے پر خون بھی جم کر لو تھڑے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مایوسی سے وہ کراہ رہا تھا۔

اس نے اپنی بیوی کے زرد اور خاموش چہرے کو چھونے کے لئے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ ڈانٹا تک نہ پہنچا۔ چنانچہ ذرا اور آگے گھسیٹ آیا اور اپنے جسم کو ایک کہنی کے سارے ذرا سا اوپر اٹھا کر اپنا ہاتھ ڈانٹا کی طرف بڑھایا لیکن اس کا ہاتھ ہوا میں ہی اٹھا رہ گیا۔

ڈانٹا کے قریب ایک سایہ کھڑا ہوا تھا۔ وہ نہ تو درخت تھا اور نہ ہی کوئی جھاڑی۔ وہ کوئی انسان تھا۔ چارلس کے دیکھتے ہی اس سائے نے حرکت کی۔ وہ ایک قدم ڈانٹا اور چارلس کی طرف بڑھا۔

چارلس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور اس نے اٹھنے کی دیوانہ وار کوشش کی۔ اور فوراً ایک آواز نے جو اس جھل کی طرح گھمبیر تھی۔

”مسٹر چارلس! میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ۔۔۔“

”کیسے ہی قہر کے“

یہ قادر شینڈور کی آواز تھی۔

اس نے ایک ٹھوکر کھائی، لڑکھڑا کر جھکا، پھر منبھلا، اپنا توازن قائم کیا اور ایک درخت کے تنے سی ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ چند منٹوں تک اپنا دم درست کرتا رہا اور پھر آگے بڑھا۔ لیکن اب اس کی قوت جواب دینے لگی تھی۔ اس کی ٹانگیں آپس میں ٹکرا رہی تھیں اور پھر وہ بالکل ہی جواب دے گئیں اور وہ اپنی بیوی کو سنبھالے ڈھے گیا۔

زمین پر کانٹے تھے، درختوں کی خشک چھال پڑی تھی اور جڑیں ابھری ہوئی تھیں، گرنے یا بیٹھنے کے لئے یہ بڑی تکلیف دہ جگہ تھی۔ لیکن چارلس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ اب اسے کسی چیز کی پروا نہ تھی۔ وہ احساس کی حدود سے پرے پہنچ چکا تھا۔ ڈانٹا اس کے ہاتھوں پر سے لڑھک کر دھپ سے نیچے جا پڑی لیکن اس کی بھی چارلس نے پروا نہ کی اور اب پروا کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ اب یہی ان کی آخری منزل تھی۔ اس سے آگے وہ نہ جاسکتا تھا۔ وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اور وہ قعر ڈریکولا کے عرفیت انہیں تلاش کرتے ہوئے شاید اسی طرف آ رہے تھے۔

چارلس اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اس کا ایک رخسار سرد زمین پر ٹکا ہوا تھا اور زمین کی ٹھنڈک رفتہ رفتہ اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر رہی تھی اور کسی درخت کی ابھری ہوئی جڑ یا شاید کوئی ٹہنی اس کی بائیں کہنی میں بیدردی سے چبھ رہی تھی لیکن اس نے ذرا بھی حرکت نہ کی۔ وہ منتظر رہا کہ زمین ایک بار پھر تیزی سے گھومنے لگ جائے، ایک بار پھر رات کا اندھیرا سرفی میں تبدیل ہو جائے اور پھر یہ سرفی اسے نگل لے اور وہ بے ہوش ہو کر اس تھکن، امیدوہیم، اور خوف سی آزاد ہو جائے۔ لیکن نہیں اس کے پھولے ہوئے سانسوں کی آواز زندگی کی آواز تھی۔ وہ زندہ تھا۔ لیکن تھک چکا تھا۔ وہ اپنی ہار تسلیم کر لیتا چاہتا تھا لیکن خود اس کے تنفس کی آواز اس کی ہمت بندھا رہی تھی۔ زندگی سے لپٹے رہنے کے لئے اسے اکسار ہی تھی

اس نے اٹھ بیٹھنے کی کوشش کی اور پھر اپنے ہاتھوں کا زور لگا کر اٹھا۔
”ڈانٹا۔ آ۔ آ۔ آ۔“

ایک دروازہ چرچا کر کھلا اور ایک راہب کمرے میں داخل ہوا۔
”شکر ہے مسٹر کینٹ کہ آپ بیدار ہو گئے۔“ راہب نے کہا۔
”میری بیوی۔۔۔۔۔“

”فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کی بیوی مزے میں ہیں اور اب تک سوری
ہیں۔ ان کی فقاہت کئی ہفتوں تک قائم رہے گی۔۔۔۔۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں وہ اچھی
ہیں۔“

”میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”فی الحال انہیں آرام کرنے کی سخت ضرورت ہے۔“

”میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ چارلس نے ضدی بچے کی طرح کہا۔

”بے شک آپ انہیں دیکھ لیں گے۔“

”کب؟“

”جب وقت آئے گا۔“

چارلس کے دماغ کے کسی گوشے میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ اتنے کم وقت میں
اتنے بہت سے واقعات ہو چکے تھے کہ وہ کسی پر اعتبار نہ کر سکتا تھا۔ کسی کی بھی ممان
نوازی ایک جال ہو سکتی تھی۔ ہر تسکین بخش لفظ اسے دھوکا دینے کے لئے کہا جاسکتا
تھا کہ اسے ہلکا پھلکا کر پھر وہاں لے جایا جائے جہاں سے وہ فرار ہوا تھا۔ وہی قصہ جو
ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا تھا اور جہاں کی ایک ایک انچ زمین پر خطرہ تھا۔ ایسا خطرہ جو
اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ کسی پر اعتبار نہ کر سکتا تھا۔ کسی
کی ممان نوازی اور ہمدردی پر بھروسہ نہ کر سکتا تھا۔

چارلس اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس دفعہ دنیا خود اس کے چاروں طرف گردش
کرنے لگی اور وہ خود شرابی کی طرح جھومنے لگا۔ فوراً ایک مضبوط ہاتھ اس کی کمر
آپڑا۔ اس ہاتھ نے اسے سارا دیا۔ اس کے ہاتھ سے تسکین اور اطمینان کی لہر
پھوٹ کر چارلس کے جسم میں سرایت کر رہی تھیں اور اسے احساس ہوا کہ وہ اب
محفوظ تھا اور ڈانٹا بھی محفوظ تھی۔

چنانچہ چارلس نے آخر کار اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب اسے ہوش آیا اور اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو پہلے تو اس کا
سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن چند لمحوں بعد ہی اس نے دیکھا کہ خوف ناک جنگل کی الجھ
ہوئی بیللیں اور خاردار جھاڑیاں بے رنگ دیواروں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ کچھ دور
تک وہ چت پڑا سوچتا رہا کہ وہ کہاں تھا؟ اوپر درختوں کی آپس میں الجھی ہوئی شاخیں
نہ تھیں بلکہ سنگین چھت تھیں۔

اس نے آہستہ سے کروٹ لی۔ وہ ایک تنگ سے حجرے میں تھا اور گھاس پر نہیں
بلکہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ بستر سخت مگر آرام دہ تھا۔ حجرے کے ایک کونے میں ایک میز
اور اس کے سامنے ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میز پر میزپوش نہ تھا اور کرسی پر گدا
نہ تھی۔ یہ دونوں چیزیں اپنی سادگی اور ننگے پن کے باوجود باعث تسکین تھیں۔

یہ ایک غیر مانوس سا کمرہ تھا۔ ایسا کمرہ جس کا وہ عادی نہ تھا۔ یہ اس کے گھر
کمرے کی طرح نہ تھا اور نہ ہی کسی ہوٹل کے کمرے جیسا تھا جس میں وہ اور ڈانٹ
اس سفر کے دوران مقیم ہوئے تھے۔ لیکن اس کمرے کی خاموشی اور ٹھنڈک میں کوئی
خاص بات تھی جو اس کے دل پر عجیب طرح سے اثر انداز ہو رہی تھی باوجود کوشش
کے وہ اس اثر کو سمجھ نہ سکا۔

”ڈانٹا!“ اس نے آہستہ سے کہا۔

اس نے پوچھا ”میں کہاں ہوں؟“

”آپ ہماری خانقاہ میں ہیں“ جواب ملا۔

”خانقاہ! کون سی خانقاہ؟“

”کیلن برگ کی خانقاہ۔“

اور اس کے دماغ کا دریچہ کھل گیا اور اسے وہ راہب یاد آگیا۔



کیا نام تھا اس کا؟ ہاں شینڈور، قادر شینڈور اور پھر اسے یاد آیا کہ قادر شینڈور نے ان سے کہا تھا کہ وہ بھولے سے بھی قصر کے قریب نہ جائیں اور پھر اسے یہ بھی یاد آگیا کہ قصر سے فرار ہونے کے بعد جب وہ جنگل میں تھا، اور ہمت ہار چکا تھا تو قادر شینڈور وہاں آگیا تھا اس کی سرزنش کے الفاظ بھی چارلس کو یاد آگئے۔

”قادر شینڈور“ اس نے کہا۔

”آپ کپڑے پہن لیجئے۔ پھر میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں گا۔ وہ خود آپ سے ملاقات کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔“ وہ دروازے کی طرف گھوم گیا ”آپ تیار ہو جائیں تو مجھے آواز دے لیجئے گا۔“

”آپ کا نام؟“

”مارک برادر مارک“

چارلس خود قادر شینڈور سے ملنا چاہتا تھا۔ جلد از جلد ملنا چاہتا تھا۔ بہت سے سوالات اس کے دماغ میں سنپولیوں کی طرح کلبلا رہے تھے اور وہ ان سوالات کے جواب حاصل کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ چنانچہ وہ کپڑے پہنے لگا لیکن ایسا معلوم ہوا کہ وہ تیزی اور پھرتی کا ثبوت نہ دے سکتا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ بھی ہلا سکتا تھا۔ وہ اس شخص کی طرح محسوس کر رہا تھا جو فالج کے شدید حملے کے بعد ابھی ابھی بستر سے اٹھا ہو۔ اس کی حرکت بے حد ست تھی جیسے اس کے اعصاب پر حکم رساں

مطالعہ گاہ میں وہ ایک اسکالر اور مفکر ظاہر ہو رہا تھا قادر شینڈور کی ایک نہیں بلکہ کئی شخصیتیں تھیں اور مختلف ماحول میں اس کی مختلف شخصیتیں نمایاں ہو جاتی تھیں اور اس کے لئے اسے کوئی ریاض نہ کرنا پڑتا تھا۔ بلکہ یہ ایک قابل رشک عطیہ تھا جو خود قدرت نے اسے عطا کیا تھا۔

حالانکہ اس کا لہجہ نرم اور شائستہ تھا۔ تاہم اس نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔
”مسٹر چارلس! قصر میں جو کچھ ہوا اس کی تفصیلات بیان کرنے کے لئے آپ تیار ہیں۔؟“

قصر میں جو کچھ ہوا تھا اس کی تفصیلات خود چارلس کے دماغ پر ایک بوجھ بنی ہوئی تھیں، اور وہ یہ بوجھ بہر حال اتار پھینکنا چاہتا تھا۔ بے شک وہ تیار تھا۔ وہ پوری داستان سنا دیتا چاہتا تھا، تاکہ پھر قادر شینڈور اس سے کوئی نتیجہ اخذ کر کے خود چارلس کو بتا سکے کہ یہ سب کیا تھا۔ تاکہ پھر اندھیرے میں روشنی غالب آجائے اس بھیاںک خواب پریشاں کی تعبیر معلوم ہو سکے۔ اور وہ لرزہ خیز سراپ ہٹ جائے جس کا سایہ چارلس اپنے سر پر محسوس کر رہا تھا۔

چنانچہ چارلس نے اپنی داستان شروع کی۔

اس نے بتایا کہ کسی طرح سرائے سے روانہ ہو کر چوراہے تک پہنچ گئے اور چارلس کو احساس ہوا کہ اس سفر کی ایک ایک تفصیل اس کے دماغ پر نقش تھی وہ کوئی معمولی سی بات بھی نہ بھول رہا تھا، خود چارلس کے لئے یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی، کہ جیسے جیسے وہ بیان کر رہا تھا۔ اس مثبت ناک داستان کی تمہیں خود بخود کھلتی جاری تھیں اور پچھلے تمام واقعات از سرنو اس کی نظر کے سامنے وقوع پذیر ہوتے جا رہے تھے، ایک بار پھر وہ انہی واقعات سے گزر رہا تھا اور انہی ناقابل فہم خطرات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ اپنی داستان سنا کر خاموش ہوا۔ تو خزاں رسیدہ

کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ یا ان میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے دماغ اور اعصاب کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ بہر حال وہ کپڑے پہننے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اب وہ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اور اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ بستر پر بیڑ گیا۔ اور کئی منٹوں تک بیٹھا رہا۔

”برادر مارک“ آخر کار اس نے آواز دی۔ اس کی آواز کھوکھلی تھی اور زیادہ بلند نہ تھی۔

فورا دروازہ کھول کر برادر مارک اندر آگیا۔

اور وہ برادر مارک کے پیچھے چل پڑا۔ اور اس نے چارلس کو قادر شینڈور کی مطالعہ گاہ میں پہنچا دیا۔

یہ کمرہ اس کمرے سے نسبتاً بڑا تھا جس میں سے چارلس نکل کر آیا تھا اس کمرے میں بھی وی سی سادگی تھی جو اس کمرے میں تھی جس میں چارلس کو ہوش آیا تھا۔ البتہ اس کمرے میں الماریوں کی ایک قطار تھی اور ان الماریوں میں موٹی موٹی اور مراکشی چمڑے کی جلد والی خوبصورت کتابیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔

قادر شینڈور اس کے استقبال کو اٹھ کھڑا ہوا اور چارلس نے دیکھا کہ اس کے بشرے سے وہ بٹاشت عیاں نہ تھی جو چارلس کو ان کی پہلی ملاقات کے وقت نظر آئی تھی۔ قادر شینڈور کے بشرے سے اس وقت سنجیدگی عیاں تھی اور وہ خود بے حد گھمبیر نظر آ رہا تھا۔ اور چارلس کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ راہب قابل رشک اور مافوق طبیعت کا مالک ہے چنانچہ وقت اور ماحول کے مطابق اپنی طبیعت اور جذبات کو تبدیل کر لیتا ہے۔ چونکہ اس وقت وہ کسی سرائے میں نہیں بلکہ خانقاہ میں تھا اور یہاں کا ماحول سنجیدہ اور خاموش تھا۔ چنانچہ خود شینڈور بھی سنجیدہ اور گھمبیر بن گیا تھا۔ اس ماحول سے باہر وہ لوگوں سے ہنس بول سکتا تھا۔ فقرے چست کر سکتا تھا لیکن یہاں اپنی

پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

”تو یہ بات ہے۔“ قادر شینڈور نے سر ہلا کر کہا، وہ پھر زندہ ہو گیا۔

”پھر زندہ ہو گیا! کون؟“

”میں یہاں کے راہبوں سے اور ارد گرد کے بستی والوں سے اور دور دور تک کے لوگوں سے کہا کرتا تھا۔ کہ اس عفریت کا جو زمانہ ختم ہوا تھا، وہ پھر واپس آ گیا ہے۔ ایک بار پھر اس کی خوفناک حکومت کا آغاز ہو گا۔“

”بچے غائب ہونے لگیں گے۔ لڑکیوں کی شہ رگ پر دو سوراخ نظر آئیں گے وہ سفید ہوتی چلی جائیں گی اور پھر مرجائیں گی لیکن مرنے کے بعد بھی انہیں سکون نصیب نہ ہو گا۔ کیونکہ مرنے کے بعد وہ ذاتوں کو اپنی قبروں سے نکل آئیں گی اور شکار کی تلاش میں بھٹکتی پھریں گی۔ پھر وہ واپس آ گیا ہے۔ وہ زندہ ہو گیا ہے۔“

”کون؟ کس کے متعلق کہہ رہے ہیں آپ؟“

”مسٹر چارلس! آپ اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ اس کے باوجود مجھ

سے پوچھ رہے ہیں۔“

”کونٹ ڈریکولا! لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”وہ تو مرچکا تھا۔“

”بے شک۔ لیکن اب وہ زندہ ہے۔“

”کیسے یقین۔۔۔“

”خود آپ اسے دیکھ چکے ہیں۔ وہاں قبر ڈریکولا میں آپ اس سے ہاتھ پائی کر چکے

ہیں۔“

”لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔“

”مسٹر چارلس آپ نہیں جانتے کہ کہاں آگئے ہیں۔“

”کہاں آگیا ہوں؟“ چارلس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ یا تو وہ پاگل ہو گیا ہے یا پھر ساری دنیا پاگل ہو گئی ہے۔

”ویپائروں کی سرزمین میں۔“

”ایں!“ چارلس چکر اگیا۔

اور خود آپ کے بھائی نے اسے حیات نو بخشی ہے۔ جو دنیا کے تمام ویپائروں کا آقا ہے جو سب سے زیادہ خطرناک ہے۔“

”میرے بھائی نے! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”مسٹر چارلس! آپ کے بھائی اس لئے مارے گئے کہ کونٹ ڈریکولا زندہ ہو جائے

اور وہ زندہ ہو گیا دنیا کا سب سے زیادہ لعنتی اور سب سے زیادہ خطرناک ویپائر۔“

چارلس حیران تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ قادر شینڈور جو کچھ کہہ رہا ہے وہ حقیقت تو نہیں ہو سکتی، یہ راہب شاید مذاق کر رہا تھا۔

چارلس نے ویپائروں کے متعلق بہت کچھ پڑھا تھا۔ خوبصورت جلد والی کتابوں میں پڑھا تھا۔ اپنے وطن لندن اور اپنے آراستہ اور روشن کمرے میں آرام دہ کرسی میں بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ اسے یہ کتابیں بڑی دلچسپ معلوم ہوئی تھیں سادہ لوح دیہاتیوں اور کاشت کاروں کی اس توہم پرستی پر وہ مسکرایا کرتا تھا۔

”یقین نہیں آ رہا مسٹر چارلس؟“ قادر شینڈور نے اس کی دلی کیفیت معلوم کر کے کہا۔ ”کونٹ ڈریکولا“ آپ کے وطن میں لندن آچکا ہے ثبوت چاہتے ہو؟ اور قادر شینڈور نے ایک فائل میں سے کسی اخبار کا تراشہ نکال کر دیکھا۔ اور پھر آہستہ سے اس کی طرف بڑھا دیا۔

”پڑھو اسے۔“

یہ اخبار ”ڈیلی گراف“ کا تراشہ تھا۔ چارلس پڑھنے لگا۔

دقت تک لنگر نہ اٹھائیں گے جب تک کہ طوفان گزر نہیں جاتا۔ شام ہوتے ہوتے ہوا بند ہو گئی۔ آدمی رات ہوئی تو ہوا نام کو نہ تھی۔ اور فضاء میں ایسی خاموشی تھی جو عموماً طوفان سے پہلے ہوتی ہے ایسی خاموشی اور اعصاب پر سوار ہو جانے والی رات کا تجربہ دھبئی کے باشندوں کو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ فضا میں اتنا گھجس تھا کہ لوگوں کے دم گٹ رہے تھے۔ سمندر سنسان تھا۔ ماہی گھو اپنی کشتیاں ساحل پر لے آئے تھے۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے جہاز بھی جو ساحلوں کے قریب چکر لگایا کرتے ہیں محفوظ مقامات پر پہنچا دیئے گئے تھے۔ سمندر ویران تھا۔ البتہ ایک بدیسی جہاز دور نظر آ رہا تھا۔ اس جہاز کے سب ہی بادبان کھلے تھے اور وہ مغرب کی طرف جاتا معلوم ہوتا تھا۔ اس جہاز کے کپتانوں کی لاعلمی اور حماقت بحث کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ بندرگاہ کے محافظوں نے جھنڈیوں کی زبان میں اس بدیسی جہاز کے کپتان کو متوقع خطرے سے آگاہ کرنے کے کی کوشش کی لیکن کچھ نہ ہوا۔ جہاز کے تمام بادبان بدستور کھلے تھے رات کا اندھیرا اترنے سے پہلے تک وہ جہاز اپنے کھلے ہوئے بادبانوں سمیت دیکھا گیا۔ وہ یوں ڈول رہا تھا جیسے اس کا کوئی مالک ہی نہ ہو۔ جیسے وہ بے سارا ہو۔

دس بجنے سے کچھ پہلے ہوا بالکل بند ہو گئی اور فضا اتنی خاموش تھی کہ چراگاہ میں مہیا کی ہوئی بھیڑوں اور دور گھاٹی میں بھونکتے ہوئے کتوں کی آوازیں قصبے کے آخری سرے تک سنی گئیں۔ آدمی رات کا گمربجے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ سمندر کی دسعتوں میں سے گڑگڑاہٹ کی عجیب سی آواز سنائی دی۔ جس کی گونج خاموش فضا میں بہت دیر تک تیرتی رہی۔

اور پھر حیرت انگیز سرعت سے، جو قطعی ناقابل یقین اور بعد میں غور کرنے سے ناممکن معلوم ہوئی۔ طوفان پھٹ پڑا، فضا کا سکون درہم برہم ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سمندر میں کوہ پیکر موجیں اٹھنے لگیں۔ طوفان کا زور دم بدم بڑھتا ہی چلا گیا اور سمندر

ہمارے نامہ نگار کے قلم سے

۱۸ اگست:

دھبئی۔

ایک زبردست اور ناگہانی طوفان جیسا کہ پچھلے سو سال سے نہیں دیکھا گیا، آج یہاں پھٹ پڑا، اور اس طوفان کے جو نتائج ظاہر ہوئے وہ نوعیت کے اعتبار سے انوکھے اور حیرت انگیز تھے موسم گرم تھا اور فضا میں گھس ماہ اگست میں عموماً ہوتا ہی ہے۔ ہفتے کی شام بے حد خوشگوار تھی۔ چنانچہ بہت سے شوقین مزاج لوگ اتوار گزارنے کے لئے دھبئی کے قریبی جزائر میں گئے تھے۔ ”ایما“ اور ”اسکرابو“ نامی چھوٹے جہازوں نے ان تفریح کرنے والوں کو جزائر تک پہنچانے کے لئے دھبئی سے جزائر تک کئی پھیرے کئے۔ دن، دوپہر ڈھلنے تک بے حد خوشگوار اور روشن رہا چند بے فکرے، جو اپنی شامیں دھبئی کے قبرستان میں گزارتے ہیں وہاں گئے وہ پرسکون سمندر کا نظارہ کر رہے تھے کہ ان میں سے ایک کی نظر اچانک کسی انجانے جہاز پر پڑی جو بہت دور تھا۔ اور جیسے یکایک ہی جنوب مغربی افق سے نمودار ہو گیا تھا۔ اس وقت شمالی مشرق کی طرف سے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے۔ بحری پولیس کا ایک آدمی فوراً اس پہاڑی پر پہنچ گیا جس پر قبرستان ہے اور اس نے دورین کے ذریعے دور نظر آتے ہوئے جہاز کا معائنہ کیا اور پھر بندرگاہ کے افسروں کو اطلاع دی۔ ایک بوڑھے ماہی گھو نے، جو اسی قبرستان میں بیٹھا کرتا ہے، زبردست طوفان کی پیشین گوئی کی سورج غروب ہونے کا منظر اتنا مسور کن تھا کہ اسے دیکھنے کے لئے دھبئی کی نصف آبادی قبرستان والی پہاڑی پر جا چڑھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ غروب آفتاب کا ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ناگہانی اور زبردست طوفان کی افواہ اب عام تھی۔ چنانچہ ان کپتانوں نے جن کے جہاز دھبئی کی بندرگاہ میں لنگر انداز تھے۔ فیصلہ کیا کہ وہ اس

تک استعمال نہیں کی گئی تھی۔ لیکن آج اس کی قوت آزمانے کا وقت آیا تھا چنانچہ چند ثانیوں بعد ہی روشنی کی موٹی لکیر اندھیرے اور امواج سمندر کے سینے پر دوڑ گئی۔ ایک دو دفعہ اس سرچ لائٹ نے بڑا کام بنایا۔ مچھلیاں پکڑنے کی ایک کشتی جو اندھیرے میں ٹانگ ٹوئیاں مار رہی تھی، اس کی روشنی میں صحیح سلامت بندرگاہ تک پہنچ گئی۔ ورنہ وہ جنوبی چٹان سے ٹکرانے ہی والی تھی جب بھی کوئی کشتی ساحل یا بندرگاہ پر پہنچتی وہاں کھڑے ہوئے لوگ خوشی کے نعروں اور تالیوں سے اس کا استقبال کرتے اور وہاں کھڑے ہوئے وہ لوگ تھے جن کا دنیا میں کوئی نہ تھا اور جن کی بے فکری ضرب المثل تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی سرچ لائٹ کی روشنی میں ایک جہاز نظر آیا جس کے سارے بادبان کھلے تھے اور جو طوفان میں تنکے کی طرح ڈول رہا تھا یہ وہی بدلی جہاز تھا جو شام کو بہت دور دیکھا گیا تھا۔ ہوا میں اور زیادہ تیزی آگئی تھی اور ساحل پر کھڑے ہوئے لوگ اس جہاز کے انجام کے خیال سے کانپ اٹھے تھے۔ بیشک وہ جہاز خطرے میں تھا۔ بندرگاہ اور جہاز کے درمیان وہ زیر آب چٹانیں تھیں جن سے ٹکرا کر کئی جہاز غرق ہو چکے تھے۔ موجوں کی کوہ پیکری میں کمی واقع نہ ہوئی تھی اور وہ جہاز اس تیزی سے ڈول اور بہہ رہا تھا کہ بقول ایک ملاح ”اب وہ سمندر کی تہ میں ہی لنگر انداز ہوگا“ دفعتاً بہت سا جھاگ فضا میں بکھر گیا اور ساتھ ہی غم آلود کرنے ساحل پر کھڑے ہوئے لوگوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اتنا گاڑھا تھا وہ کہ کمر ٹھوس معلوم ہوتا تھا۔ اس کرنے ساحل پر کھڑے ہوئے لوگوں کو عارضی طور پر اندھا کر دیا تھا البتہ ان کی قوت سامعہ قائم تھی اور وہ کڑک اور گرج کی آوازیں، جن کی شدت پچھلی تمام آوازوں سے بڑھ کر تھی سن رہے تھے۔ سرچ لائٹ کا رخ مشرقی چٹان کی طرف پھیر دیا گیا تھا اور اس طرف روشنی ڈالی جا رہی تھی جس طرف کہ اس

کی ہر موج پہلی موج سے زیادہ تباہ کن اور بھیا تک ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ سمندر سے کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا شور بلند ہوا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ لوگ کھمبوں وغیرہ سے لپٹ گئے کہ اڑ نہ جائیں۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ ہوا میں سیٹی کے بجائے گڑگڑاہٹ کی آواز تھی۔ جو لوگ قبرستان والی پہاڑی اور بلند مقامات پر کھڑے ہوئے تھے انہیں وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ ایک طوفان ہی کیا کم تھا کہ دفعتاً ”سمندر سے گاڑھا گاڑھا کراٹھ کراٹھ کر ساحل پر پھیلنے لگا۔ کمر مرطوب تھا۔ اس قدر مرطوب کہ لوگوں کو یہ وہم ہو گیا کہ یہ کمر دراصل ان لوگوں کی روحیں ہیں جو سمندر میں غرق ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ جواب تک ساحل سمندر اور بندرگاہ پر کھڑے تھے بدحواس ہو کر اپنے گھروں کی طرف بھاگے۔ ہمارا نامہ نگار کہتا ہے کہ فضا میں کوئی خاص بات تھی جس نے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے فضا میں موت رچی ہوئی تھی۔ اور ناقابل فہم کمر گویا موت کا فرشتہ سرد اور بھیا تک کمر کی چادر میں دقا ”فوقا“ شکاف پڑ جاتے اور آسمان پر کوندتی ہوئی بجلی میں سمندر مہیب دیو کی طرح نظر آتا۔ آسمان پر بار بار بجلی کوند رہی تھی اور کڑک اور گرج کی آوازیں لوگوں کے دل ہلا رہی تھیں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ساتوں آسمان آپس میں ٹکرا رہے ہیں لوگ اپنے گھروں میں سے بیٹھے تھے اور بوڑھے کہہ رہے تھے کہ یہ قہر الہی ہے جو دمبٹی پر نازل ہوا ہے۔ کمر کی چادر میں شکاف پڑنے اور بجلی کے چمکنے سے جو منظر دیکھنے کو ملتا تھا وہ بے حد دلچسپ تھا۔ سمندر کی ہر کوہ پیکر موج سفید سفید جھاگ کو حیرت انگیز اونچائی تک اچھال دیتی تھی۔ اور اس جھاگ کو تیز پھینکتی ہوئی ہوا فضا میں یوں بکھیر دیتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے آتش بازی کے ٹھنڈے اتار چھوڑ دیئے گئے ہوں، آبی پرندے، جو گھبرا کر اپنی پناہ گاہوں سے نکل آئے تھے۔ تیز پھینکتی ہوئی ہوا میں بے بسی سے قلابازیاں کھا رہے تھے۔ مشرقی چٹان کی چوٹی پر جو نئی سرچ لائٹ لگائی گئی ہے وہ آج

اندھرا اتر آیا تھا اس وقت کہ سرچ لائٹ کی خیرہ کن روشنی بھی کچھ کام نہ دے رہی تھی۔۔۔

چارلس نے خاموشی سے ڈیلی گراف کا یہ تراشہ فادر شینڈور کی طرف بڑھا دیا۔
”تو اس رات مسٹر چارلس“ فادر شینڈور نے تراشہ فائل میں رکھتے ہوئے کہا
”کونٹ ڈریکولا د مبی کے ساحل پر اتر ا تھا“

”لیکن اس تراشے میں کونٹ ڈریکولا یا کسی بھی مسافر کا ذکر تو ہے نہیں“ چارلس نے حیرت سے کہا۔

”ایک جگادری اور خونخوار کالے کتے کا ذکر تو ہے نا؟“

”ہاں ہے“

”بس تو وہی کالا کتا کونٹ ڈریکولا تھا اور عناصر کا وہ نکڑا اسی نے پیدا کیا تھا کہ کوئی اسے ساحل پر اترتے نہ دیکھ سکے اور اس کا تعاقب نہ کرے۔“

”کیا کہا آپ نے فادر کہ وہ کتا ڈریکولا تھا“

”بالکل“

”تو پھر معلوم ہوا کہ وہ اپنا روپ بدل سکتا ہے۔“

”بے شک۔ وہ جو چاہے بن سکتا ہے۔ خصوصاً چمگادڑ اور بھیڑیا“

”اگر ایسا ہی ہے تو پھر جب ہم قصر میں سے فرار ہوئے ہیں تو اس وقت بھی وہ چمگادڑ یا بھیڑیا بن کر ہمارا تعاقب کر سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔“ چارلس نے بے یقینی سے کہا۔

”ہاں لیکن ابھی وہ اس درجے تک نہیں پہنچا ہے بات یہ ہے کہ وہ دس سال کے بعد زندہ ہوا ہے۔ آپ کے بھائی کے خون نے اسے زندہ کیا ہے اور آپ کی بھابی کا خون جو اس نے اپنی دس برس کی پیاس بجھائی ہے لیکن اب بھی وہ کمزور ہے

بدی جہاز کے چٹانوں سے ٹکرانے کا خدشہ تھا۔ لوگ دم سادھے اس جہاز کے انجام کے منتظر تھے یکایک ہوا کا رخ بدل گیا، جھاگ بیٹھ گیا اور پھر ایک معجزہ ہوا۔۔۔۔۔ دونوں چٹانوں کے درمیان یکایک وہ جہاز نمودار ہوا جس کی تباہی کے خیال سے لوگ کانپ رہے تھے۔ اب بھی اس کے بادبان کھلے تھے اور اب اس کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ سرچ لائٹ جہاز کے ساتھ ساتھ کھومتی رہی اور جب وہ جہاز قریب آیا تو سرچ لائٹ کی روشنی میں لوگوں نے ایسا منظر دیکھا کہ بعض کی چیخیں نکل گئیں۔ پتوار کے ڈنڈے سے ایک طلاح کی لاش بندھی ہوئی تھی جس کا آگے کی طرف ڈھلکا ہوا سر ایک بھیانک انداز میں دائیں بائیں ڈول رہا تھا۔ عرشے پر اس لاش کے علاوہ کوئی اور نظر نہ آ رہا تھا۔ یہ واقعی ایک حیرت انگیز بات تھی بلکہ معجزہ تھا کہ وہ جہاز اپنے آپ ہی صحیح سلامت بندرگاہ تک آگیا تھا جہاز بندرگاہ میں رکنے کے بجائے آگے بڑھ گیا اور ساحل پر پڑے ہوئے ریت اور کنکر کے اس انبار پر جا چڑھا جو سمندر کے مد جزر سے اس پہاڑی کے قدموں میں جمع ہو گیا تھا۔ جس پر قبرستان واقع ہے۔ اور جسے ہمارے قصبے کے لوگ ٹیٹل کہتے ہیں۔

جب وہ جہاز ریت اور کنکر کے انبار پر چڑھا تو ایک زبردست دھماکہ ہوا بادبانوں کے مستول چہرے آکر گرے اور رے ٹوٹ گئے اور بلیاں زبردست آواز کے ساتھ عرشے پر گریں اور ساتھ ہی ایک حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ جیسے ہی جہاز ساحل پر چڑھا یکایک ایک کالے رنگ کا جگادری اور خونخوار کتا جہاز کے کسی نچلے کمرے میں سے یوں اچھل کر عرشے پر آیا جیسے اسے توپ میں بھر کر چھوڑا گیا ہو۔ وہ حیرت انگیز پھرتی سے ساحل پر کودا اور بے تحاشہ اس پہاڑی کی طرف بھاگا جس پر قبرستان اور پرانا گرجا واقع ہے۔ اس طرف سے پہاڑی اتنی عمودی ہے کہ اس پر کوئی جانور حتیٰ کہ پہاڑی بکرا بھی نہیں چڑھ سکتا۔ وہ کالا کتا جلد ہی اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اور ایسا

اگر ڈریکولا نے ایک بار پھر اپنی قوتیں حاصل کر لیں تو یہ تمام ڈائٹس ایک بار پھر آزاد ہوں گی۔ ڈریکولا کا اثر دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور وہ کئی صدیوں سے زندہ تھا کئی دفعہ ہم نے یقین کر لیا کہ وہ مردہ ہو گیا لیکن تبھی وہ زندہ ہو کر واپس آ گیا۔ اور ہر دفعہ اس نے اپنا اثر دور دور تک پھیلا کر گویا اپنی لعنتی حکومت قائم کر لی۔

شینڈور خاموش ہو کر ڈائری کے ایک صفحہ پر جھک گیا اور چند ٹائپوں کے توقف کے بعد بولا۔

دس برس پہلے ہم نے یقین کر لیا تھا کہ ڈریکولا کا خاتمہ ہو گیا لوگوں نے مذہبی رہنماؤں نے اور حکومت نے بڑی کوششوں سے تلاش کر کے ایک ایک ڈائن اور ڈریکولا کے ایک ایک ساتھی کا خاتمہ کر دیا تھا اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا تھا یہاں تک کہ صرف ڈریکولا باقی رہ گیا تھا..... دس برس پہلے چند جبالے انگریزوں نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا لیکن..... اب معلوم ہوتا ہے کہ آخری رسوم اوانہ کی گئی تھی شاید اس کے سینے میں کھوٹا نہ ٹھونکا گیا۔ چنانچہ وہ لوگوں کی نظر کے سامنے مرنے لگا لیکن اس کا خاتمہ نہ ہوا اور وہ انتظار کرتا رہا..... ان شرائط کے پورا ہونے کا انتظار کرتا رہا جو ایک بار پھر اسے زندہ کر دیں گی اور تمہارے بد قسمت بھائی تھے جنہوں نے یہ شرائط پوری کر دیں اور آخر کار یہ مردہ جس کا نام کونٹ ڈریکولا ہے، ایک بار پھر اپنی قبر میں سے نکل آیا۔“

شینڈور نے جو کچھ کہا تھا اس کی حقیقت اس کی آنکھوں سے عیاں تھی چنانچہ ہارلس اس سے نظر نہ ملا سکتا تھا۔ فادر شینڈور نے جو کچھ کہا تھا وہ یقیناً جھوٹ نہ تھا۔ ہارلس شینڈور کے پیچھے الماری میں رکھی ہوئی کتابوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان کتابوں میں اس عذاب کی پوری داستان محفوظ تھی جو صدیوں سے اس علاقے پر ڈریکولا اور اس کی ”دہنوں“ کی شکل میں نازل ہوا تھا۔

چنانچہ جب تک وہ مزید لڑکیوں یا مردوں یا بچوں کا خون نہیں پی لیتا اس کے روپ بدلنے کی قوت عود نہیں کر سکتی۔“

چارلس کانپ گیا۔

”میری بھابی.....“ اس نے کہا۔

”آپ کی بھابی اب اس عفریت کی دہن بن چکی ہیں۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ کی بھابی بھی اب ڈائن ہیں۔ ڈریکولا جس لڑکی کا خون پیتا ہے وہ ڈائن بن جاتی ہے۔“

”میرے خدا!“ چارلس نے مردہ آواز میں کہا۔ ان باتوں کو میں وہی دماغ کی اچھ سمجھے ہوئے تھا۔“

فادر شینڈور نے گھوم کر اور ہاتھ برہا کر اپنے پیچھے والی الماری میں سے ایک مجلد کتاب کھینٹ لی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ چارلس نے دیکھا کہ یہ کوئی چھپی ہوئی کتاب نہ تھی بلکہ نہایت صاف خط میں لکھی ہوئی ایک ڈائری تھی۔

”کاش کہ یہ باتیں وہی دماغ کی اچھ ہی ہوتی“ شینڈور نے کہا۔

”لیکن یہاں کارہنہا میں ہم ویسپائز کو دیو مالا کی کہانی اور توہم پرستی کہہ کر اس سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ مسٹر چارلس ہمارے زمانے کے ماضی قریب میں یہ عفریت، جو آپ کو دیو مالا کا ایک کردار معلوم ہوتا ہے ایک ٹھوس حقیقت تھا لیکن ہمیں امید تھی کہ آئندہ ہمارے یہاں ویسپائز نہ ہوں گے اس لعنتی طریق کے سوتے خود ڈریکولا سے پھوٹے ہیں۔ خود اس کی شیطانی کارستانیوں کی وجہ سے کئی بے گناہ شیر خوار بچے غائب ہوئے اور کئی معصوم لڑکیاں ڈائٹس بنیں۔ آپ نے جنگل میں نیلے نیلے شٹلے دیکھے ہوں گے۔ یہ ڈائٹس تھیں لیکن ڈریکولا کے بعد ان کا زور ختم ہو گیا۔“

اور چارلس نے دانت پس کر کہا۔

”میرا بھائی مرچکا اور اس کی بیوی ڈائن بن گئی چنانچہ ڈریکولا کو قتل کر دینا اب میرا فرض ہو جاتا ہے۔“

”مسٹر چارلس! آپ ڈریکولا کو قتل نہیں کر سکتے۔“

”قتل نہیں کر سکتا! کیوں؟“

”اس لئے کہ وہ مردہ ہی ہے۔ زندہ مردہ“

”تو پھر۔۔۔۔۔“

”اے قتل نہیں کیا جاسکتا البتہ اسے قتل کیا جاسکتا ہے، تلف کیا جاسکتا ہے۔ میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ دس برس پہلے چند جیلے انگریزوں نے ڈریکولا کو قتل کر دیا تھا۔ لیکن اس کا خاتمہ نہ کیا تھا تو اس سے میری مراد یہی تھی کہ اسے تلف نہ کیا گیا تھا۔“

”تو اسے تلف کسی طرح کیا جاسکتا ہے؟“

”مختلف طریقے ہیں۔“

”مثلاً؟“

”پہلے تو یہ سمجھ لو کہ ڈریکولا رات کے وقت ہی شکار کی تلاش میں نکلتا ہے اور دن کے وقت وہ اپنی قبر یا تابوت میں لیٹا رہتا ہے اور اس وقت وہ مجبور اور بے بس ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ دن کے وقت اس کا بھٹ اور قبر تلاش کر لیا جائے اور پھر اس کے یعنی ڈریکولا کے سینے میں اس طرح کھونٹا ٹھونک دیا جائے کہ وہ اس کے دل کے آپار ہو جائے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے سورج کی شعاعوں کے سامنے براہ راست ڈال دیا جائے اس کے علاوہ ہتھ پانی اسے غرق کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ بہت قریب ہو جائے تو صلیب اسے جلا کر خاکیر کر سکتی ہے۔ لیکن وہ کبھی صلیب

کے قریب نہ آئے گا۔ مطلب یہ کہ ڈریکولا فانی نہیں ہے“

”یہ تو بڑے آسان طریقے ہیں“

”جی نہیں۔ ملی کی کھال اوڑھنی ہو تو پہلے اسے پکڑنا پڑتا ہے، چکاڈر کے بازو اسی وقت نوچے جاسکتے ہیں جب وہ آپ کے ہاتھوں میں ہو۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”مسٹر چارلس! میرے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا کہ بادی لافظ میں معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف یہ کام نہ صرف بہت مشکل بلکہ بے حد خطرناک بھی ہے۔“

”خطرناک کیسے ہے؟“

”ایسے کہ چند دوسرے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی مدد کریں گے۔“

”یعنی دوسرے ویپار!“

”جی نہیں بلکہ ہماری آپ کی طرح عام انسان جو کسی ایسے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو

تقریباً ڈریکولا میں مختلف خدمات انجام دیتے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ہیں جو ویپار نہیں ہیں لیکن کسی خاص وجہ سے۔۔۔۔۔ اور یہ وجہ اب تک سمجھ میں نہیں آسکی۔۔۔۔۔“

”وہ ڈریکولا کے فرماں بردار اور اس کے زیر اثر ہیں۔ جیسے ڈریکولا کا ملازم۔۔۔۔۔“

”کلیو!“

”ہاں وہ بھی۔ انہیں لوگوں میں سے ایک ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے یہ آخری دن برس تقریباً ڈریکولا میں اسی موقع اور وقت کے انتظار میں گزارے ہوں گے جو آپ

نے گزشتہ رات میا کر دیا..... یعنی اپنے آقا کو دوسری زندگی بخشے کا موقع۔

”لیکن اب کیا ہو گا جب کہ اسے دوسری زندگی بخشی جا چکی ہے؟“

فادر شینڈور نے کتاب بند کر کے اس پر یوں سر جھکا دیا جیسے وہ کتاب مقدس ہو۔

”یہ تو ہم نہیں جانتے کہ اب کیا ہو گا۔ اگر جانتے ہوتے تو.....“

”تو کیا ہوتا؟.....“ چارلس نے بے تابی سے پوچھا۔

”تو ہم کم سے کم یہ معلوم کر سکتے کہ اب کون سا قدم اٹھایا جائے ہمیں کوشش

کرنی چاہیے کہ یہ وبا اس علاقے میں نہ پھیلنے پائے۔ ڈریکولا زندہ ہو چکا ہے اور اگر

جلد ہی اس کا خاتمہ نہ کر دیا گیا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ اگر اس نے

اپنے مافوق الفطرت قوتیں حاصل کر لی ہیں، اگر اسے زیادہ سے زیادہ خون مل گیا۔ تو پھر

ویپار پیدا ہوں گے اس کی وجہ سے عورتیں ڈائیس بنیں گی اور پھر ہمارے بنائے کچھ

نہ بنے گا۔

”مسٹر چارلس!“ فادر شینڈور نے بڑی سنجیدگی سے اضافہ کیا ”ویپار حیرت

انگیزی اور تیزی سے بڑھتے اور پھیلتے ہیں۔ انسانوں کے مقابلہ میں سنگتی اور جانوروں

کے مقابلے میں دگنی تیزی سے ان کی نسل میں اضافہ ہوتا ہے۔

اور چارلس کو کونٹ ڈریکولا کی شدید پیاس کا بلکہ خون کے ہو کے کا خیال آیا۔

اور ایک بار پھر تصور کی نظر سے اس نے اپنے بھائی کی لاش دیکھی جو وہاں قصر ڈریکولا

کے تہ خانے میں ایک صندوق میں ٹھونس ہوئی تھی، سرکئی اور خردی ہوئے لاش اس

کے بھائی کے خون نے اس عفریت کو زندگی بخشی تھی اور پھر وہ ہیلن کا خون پی چکا تھا

اور ہیلن ڈائن بن چکی تھی..... چارلس کانپ گیا..... میرے خدا! خود وہ اور ڈائن اس

تباہی کے کسی قدر قریب تھے جو موت نہ تھی..... جو زندگی بھی نہ تھی..... اگر ڈریکولا

نے اس کا اور ہیلن نے ڈائن کا خون پی لیا ہو تو وہ ڈریکولا کی طرح ایک لعنتی ویپار

اور ڈائن ہیلن کی طرح ایک ڈائن بن جاتی اور پھر وہ خود دوسروں کا خون پیتا اور ڈائن

بچوں کو چراتی کہ ان کے خون سے اپنی پیاس بجھائے اور خدا جانے کب تک.....

شاید قیامت تک یا اس وقت جب تک کوئی ان دونوں کو فنا نہ کر دیتا..... ان کی یہ

زندگی جو قطعی زندگی نہ تھی قائم رہتی۔

چارلس کے ماتھے سے ٹھنڈا ہینہ ٹپکنے لگا۔

”میں۔ میں۔ اپنی بیوی سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ہاں، ہاں۔“ فادر شینڈور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں چاہتا تھا کہ ہم آپ تفصیل سے

مفتگو کر لیں اور اس عرصہ میں آپ کی بیوی کو مزید آرام کرنے کا موقع مل جائے۔“

”لیکن میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ شکر اور پریشان ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ

سب ٹھیک ٹھاک نہیں ہے۔ چنانچہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے کہ آپ کی بیوی

زندہ ہیں اور فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔“

چنانچہ وہ دونوں مطالعہ گاہ میں سے نکل کر محرابی غلام گردش میں چل پڑے۔ یہ

گزر گاہ خاموش اور ویران سی تھی اور چارلس کے دل پر اداسی اور افسردگی چھاتی

جاری تھی، لیکن ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک راہب نے مسکرا کر چارلس

کی طرف دیکھا، تو اس کی ڈھارس بندھی یہ اس شخص کی مسکراہٹ تھی، جو بنی نوع

انسان سے محبت کرتا تھا، اور تمام تر ہمدردیاں ان پر نچھاور کر دیتا تھا۔ اور اس کے

موضع کوئی چیز نہ طلب کرتا تھا اور چارلس نے محسوس کیا کہ یہ خاتہ ایک محفوظ قلعہ

تھا اس منحوس قصر سے زیادہ محفوظ جو ایک پہاڑی پر کھڑا ہوا تھا اور جو قصر ڈریکولا کے

نام سے مشہور تھا۔

فادر شینڈور نے ایک حجرے کا دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کر چارلس کو

اشارے سے اندر جانے کہ کہا۔

ڈانٹا ایک معمولی چارپائی پر ایک کھردرا کبل اوڑھے لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اس کے ماتھے پر خون دھو کر صاف کر دیا تھا لیکن اس کا رنگ وہ اب بھی مردے کی طرح زرد تھا۔ اس کی یہی رنگت دیکھ کر چارلس وہاں چوراہے کے قریب جنگل میں اس کی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا۔ اور یہ رنگت انتہائی سکون کی رنگت تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ بے جان بھی شاید ان دونوں لفظوں کا مطلب ایک ہی تھا۔ شاید اس دنیا میں سکون نہ مل سکتا تھا سکون تو قبر کے اس پار ہی میسر آ سکتا تھا۔ چارلس کانپ گیا لیکن موت بہتر تھی ہاں اس سے بہتر تھی کہ انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہے اس دھندلی دنیا میں زندہ رہے جہاں عفریت اور ڈانٹیں تھیں، جو ان کی منحوس اور بھیانک دنیا تھی بے شک اس سے موت بہتر تھی کہ انسان زندہ مرنا بن جائے۔ اور ڈانٹا شاید وہ اسی دنیا میں پہنچ گئی تھی، اس کی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ وہ چارلس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اس نے گھوم کر پیچھے کھڑے ہوئے فادر شینڈور کی کلائیاں پکڑ لیں اور تقریباً چیخ کر کہا۔

”آپ نے تو کہا تھا کہ میری بیوی“

”آپ کی بیوی کی حالت اطمینان بخش ہے۔“ فادر شینڈور نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”چوبیس گھنٹے اور آپ کی بیوی پوری طرح صحتیاب ہو چکی ہو گی۔“

”کیسے یقین کر لوں!“

”آپ کو مجھ پر اعتبار ہے یا نہیں؟“

چارلس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر یقین کیجئے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا اور یقین کیجئے کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ خطرہ ٹل گیا اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہوش آجائے گا۔“



چارلس کی گرفت شینڈور کی کلائیوں پر ڈھیلی پڑ گئی اس کا سر شرم اور ندامت سے جھک گیا۔ اور اس کی انگلیوں نے شینڈور کی کلائیوں کو چھوڑ دیا اور اس کے ہاتھ تقریباً بے جان سے ہو کر اس کے دائیں بائیں لٹک گئے۔

”آئیے“ فادر شینڈور نے کہا۔

دونوں حجرے سے باہر آ گئے اپنی بیوی کو یوں بے سدھ پڑے دیکھ کر اور اس کے مروجے کی سب رنگت دیکھ کر چارلس کے دل کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ حالانکہ اسے فادر شینڈور پر اعتبار تھا اور اس نے ڈانٹا کے رو بہ صحت ہونے کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس پر چارلس کو یقین تھا تاہم وہ اپنی فکر و پریشانی پر قابو حاصل نہ کر سکا تھا۔

حجرے سے باہر آ کر فادر شینڈور نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور وہ دونوں پھر محرابی گزرگاہ میں چل پڑے ایک راہب گزرگاہ کے انتہائی سرے پر سے ان کی طرف آ رہا تھا۔ یہ برادر مارک تھا وہی جس نے چارلس سے اس وقت گفتگو کی تھی، جب اسے، یعنی چارلس کو ہوش آیا تھا۔

”فادر! لڈوگ آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔“ برادر مارک نے قریب آ کر کہا۔

فادر شینڈور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تو برادر مارک پلٹ کر جس طرح آیا تھا۔ اسی طرح خاموش اور متوازن قدموں سے چل دیا اور چارلس نے اپنی دل میں رشک کی ایک لہری محسوس کی، کس قدر خاموش اور پرسکون زندگی تھی ان لوگوں کی! اور چارلس نے سوچا کہ جب وہ اس خانقاہ سے چلا جائے گا اور جب وہ لندن کی روشنیوں

گزر گاہیں یکساں تھیں۔ ایک موڑ مڑیے اور سامنے دوسری محرابی چھت ہوگی۔ دوسری گزر گاہ کے سامنے ہوگی۔ اب یہ خاموشی نیم تاریک اور سرد گزر گاہیں سکون بھی بخش سکتی تھی۔ یا پھر خوفزدہ بھی کر سکتی تھیں غالباً یہی وجہ تھی کہ فادر شینڈور وقتاً فوقتاً "فرار اختیار کرتا تھا اور اس خانقاہ میں سے نکل کر عارضی طور پر بیرونی دنیا کے شور اور گھما گھمی میں کھوجاتا تھا تاکہ اس کا دماغی توازن اس یکسانیت سے بگڑ نہ جائے یا اس کی طبیعت بگڑ نہ جائے ماحول کی یہ تبدیلی یقیناً اس دماغ کو جلا دیتی تھی یا پھر وہ فرض تھا، کوئی اہم فرض، جو اسے خانقاہ میں سے نکال لاتا تھا اور ممکن تھا کہ خانقاہ کی یہ خاموشی اور یہ سکون اسے روحانی سکون بخشتا ہو، بہر حال یہ تو حقیقت تھی کہ اس خانقاہ کا ماحول چارلس کو سکون بھی بخش رہا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے اعصاب پر سوار بھی ہو رہا تھا۔

برادر مارک دروازے کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا فادر شینڈور اور چارلس اس کے قریب پہنچے، تو اس نے کمر سے جھک کر دونوں کو سلام کیا اور دروازہ کھول کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

فادر شینڈور اور چارلس حجرے میں داخل ہو گئے۔

یہ کمرہ نسبتاً بڑا تھا اور حالانکہ اس کا فرنیچر محض رسمی سا اور مختصر تھا، تاہم خدا جانے کیوں یہ کمرہ خاصاً آرام دہ معلوم ہوتا تھا اس میں کوئی خاص بات تو نہ تھی، البتہ اس کے کمین کی وجہ سے اس کمرے کو ایک قسم کی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔

لڈوگ طویل القامت شخص تھا اور اس کی آنکھیں جلتی ہوئی تھیں، جیسے کسی بھیڑیے کی آنکھیں ہوں۔ اس کی ایک ایک حرکت سے اعصابیب ہیجان اور سمجھ میں نہ آنے والی اندرونی بے چینی عیاں تھی۔ بظاہر وہ پرسکون معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ایک طرف پڑے ہوئے برش، رنگ کینو اس کے ٹکڑے، کپڑوں کی دھجیاں اور دوسری بے

اور گھما گھمی میں پہنچ جائے گا تو پھر اس خانقاہ کی رہائی سکون اور خاموشی کو بھول جائے گا۔ یا کم سے کم اس کی کوشش ضرور کرے گا۔ لیکن پچھلے دن اور رات کی سنسنی کے بعد گزشتہ رات کے پاگل کردینے والے خوف کے بعد یہاں اسے سکون اور اطمینان نصیب ہوا تھا اور پچھلے خوف اور سنسنی سے اسے ایک حد تک نجات مل گئی تھی۔ چارلس نے کوشش کر کے یہ خیالات جھٹک دیئے۔ فادر شینڈور بہر حال جذباتی اور تنگ نظر نہ تھا۔

"مسٹر چارلس! میرے ساتھ آئیے۔" فادر شینڈور نے کہا اور اپنی رفتار تیز کر دی "لڈوگ بے حد دلچسپ آدمی ہے۔ آپ کی طبیعت ذرا بہل جائے گی۔"

"کون ہے یہ لڈوگ؟"

"یہ بھی آپ ہی کی طرح ایک مسافر تھا ایک رات قعر ڈرائیولا کے قریب یہ مجھے مل گیا تھا اس نے یا تو کوئی انوکھی بات یا کوئی بھیاںک چیز دیکھی تھی یا شاید کوئی خوفناک تجربے سے دوچار ہوا تھا۔ بہر حال اس کا دماغ چل گیا۔ اس کی یادداشت ختم ہو گئی اور میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے خود لڈوگ کے حق میں یہ اچھا ہی ہوا۔ میں اسے یہاں لے آیا اور پچھلے بارہ برس سے وہ ہماری خانقاہ میں ہی مقیم ہے۔ بے حد صابر اور راضی برضا قسم کا انسان ہے، یہ لڈوگ کو کسی بھی شیطانی قوت نے اسے اپنے اثر میں کیوں نہ لے لیا ہو، وہ اب اس اثر کو جھٹک چکا ہے اور اس شیطانی قوت کی گرفت سے آزاد ہے اب وہ ایک ہوشیار اور عمدہ دستکار ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا یہی شغل ہے اور دستکاری کی طرف اس کی یہی محویت ہے جس نے اس کی ان یادوں کو مٹا دیا ہے جو اس کے دماغ پر نقش ہو چکی تھیں۔ ان واقعات کی یادوں کو جن سے قعر ڈرائیولا کے قریب یا خود قصر میں دوچار ہوا تھا۔ اب وہ پرسکون اور مطمئن ہے اور اس شیطانی اثر سے آزاد جو کبھی اس کے لئے اذیت ناک تھا۔"

چارلس نے اس داغ کو پہچان لیا۔ ایک موٹی سی پچی ہوئی مکھی تھی یہ۔

اور اب لڈوگ کو چارلس اور فادر شینڈور کی حجرے میں موجودگی کا احساس ہوا۔ اس کے باوجود وہ بڑی عیاری سے ان کی موجودگی کو ٹالتا رہا وہ بدستور بے حس اور بے پروا رہا۔ اس نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تک نہیں صاف ظاہر تھا کہ وہ جب تک چاہے گا۔ ان کی طرف نہ دیکھے گا اور اس طرح ان کی موجودگی کا اقرار نہ کرے گا۔ کسی کے بھی وجود کا اقرار نہ کرنے کی یہ ترکیب بڑی ہی مکارانہ تھی۔

لڈوگ کے ہونٹ مسکراہٹ کی صورت کھینچ گئے اور چارلس کو اس بھیریے کی طرح نظر آیا جس کی چالاکی مگر آسانی سے اپنا شکار حاصل کر لیا ہو۔ لڈوگ کی شہادت کی انٹی آگے بڑھی اور پچی ہوئی مکھی کو لٹھکانے لگی۔ میز کے ایک کونے پر دوسری مکھیوں کا جو سب کی سب مردہ اور پچی ہوئی تھیں، ایک ننھا سا انبار تھا۔ لڈوگ نے تازہ پچی ہوئی مکھی کو لٹھکا کر اس انبار میں ڈال دیا۔

فادر شینڈور آگے بڑھا۔

دفعۃً لڈوگ نے اپنے ایک ہاتھ کی ہتھیلی کا پیالا بنا کر میز کے کنارے عین نیچے رکھا، دوسرے ہاتھ سے میز کی سطح پر جھاڑوسی پھیر کر اس کے کنارے پر رکھی ہوئی مکھیوں کو سمیٹ کر ہتھیلی کے پیالے میں ٹپکا دیا، پھر اس کا یہ ہاتھ بلند ہو کر منہ تک پہنچا اور چشم زدن میں یہ مردہ مکھیاں اس کے منہ میں تھیں لڈوگ جلدی جلدی منہ چلانے لگا۔ اور انہیں چبا کر نگل گیا۔

اور اب اس نے فادر شینڈور اور چارلس کی موجودگی کا اقرار کرتے ہوئے سر کے اشارے سے انہیں سلام کیا۔

”لڈوگ! یہ کیا؟“ مکھیاں؟“ فادر شینڈور نے کہا۔

”لڈوگ نے مسرت سے سر ہلایا۔

مصرف چیزوں کا انبار لڈوگ کو پتیلوں کی صف میں سے نکال کر کاریگروں کے گروہ میں لاکھڑا کرتا تھا۔ ایک قہنجی دراز میز پر ایک چوتھائی صفحہ جڑا ہوا تھا اور اس وقت لڈوگ برش ہاتھ میں لئے بڑی نزاکت اور مہارت سے اسی صفحہ پینٹنگ کر رہا تھا وہ اپنی عجیب آواز میں کوئی سمجھ میں نہ آنے والا گیت گارہا تھا۔ لیکن اس کا ہاتھ چٹان کی طرح مستحکم تھا، چنانچہ اس نے صفحے پر جو لکیر پرش سے کھینچی تھی ہو ساہول کی ڈوری کی طرح سیدھی اور صحیح تھی۔

چارلس اور شینڈور حجرے میں داخل ہوئے تو لڈوگ نے اپنے آپ سے کہا
”بے حد شاندار..... ہم..... میرا تو یہی خیال ہے..... یعنی حقیقت میں بے حد عمدہ۔“

اس نے برش رکھ دیا اور اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا، پھر ذرا جھکا کر یوں ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھایا۔ جیسے تلوار جھونک رہا ہو، کچھ دیر تک اس کا بازو ہوا میں اٹھا رہا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے نیچے چلا اور اس کی ہتھیلی دھڑام سے میز پر آ پڑی۔ ساتھ ہی لڈوگ کے بشرے کے جذبات میں تغیر ہوا، پہلے وہ ایک تپسوی کا چہرہ تھا۔ لیکن اب وہ ایک عیار شیطان کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے کے پٹھے کھینچ گئے تھے۔ نقوش اینٹھ گئے تھے اور آنکھوں میں صحیح معنوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔

وہ آنے والوں کی طرف ذرا بھی متوجہ نہ ہوا۔ وہ انہیں بھول چکا تھا۔ وہ ہر چیز کو بھول چکا تھا۔ ہر شے کے وجود سے بے پروا ہو چکا تھا اور فکر تھی تو صرف اس چیز کی جو اس کی ہتھیلی اور میز کی سطح کے درمیان دبئی ہوئی تھی۔ اب اس کے بشرے سے فتمندی کا جذبہ عیاں تھا۔ ایک ماہر اور عیار شکاری کی طرح اس نے اپنی ہتھیلی کو ایک کنارے پر سے ذرا اوپر اٹھایا اور سر جھکا کر اس میں جھانکنے لگا اور پھر آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ اٹھالیا..... میز کی سطح پر ایک کالا داغ نظر آ رہا تھا۔

جیسے حروف اور حاشیے پر بنی ہوئی عمدہ اور سنہری ڈیزائن کی دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ کئی دن بلکہ کئی ہفتہ اس باریک اور دیدہ ریزی کے کام کی نذر ہو گئے ہو گئے۔

”کیا خیال ہے“ لڈوگ نے بتابی سے پوچھا۔ ”نفس اور عمدہ یا محض شاندار؟“
 فادر شینڈور آپ ہی آپ مسکرایا۔
 ”بے حد نفس اور بے حد عمدہ... آپ کا کیا خیال ہے مسٹر چارلس؟“
 ”بے حد حسین۔“

لڈوگ نے سر ہلا کر کانڈ ان دونوں کے سامنے سے گھسٹ لیا
 ”ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔ ”اب تم جاؤ۔ جب مجھے ضرورت ہوگی۔ تو بلا لوں گا۔“
 وہ دونوں اٹھ کر باہر آ گئے۔ دروازہ کے باہر برادر اور مارک کھڑا ہوا تھا، اس نے فوراً ہی دروازہ بند کر کے اس میں قفل ڈال دیا۔
 ”یہ حجرہ۔“ چارلس نے خدا جانے کیوں بے چینی محسوس کر کے دل ہی دل میں کہا۔ ”قید خانہ کا کمرہ بن گیا ہے“
 اور پھر اس نے فادر شینڈور سے پوچھا۔
 ”فادر! یہ احتیاط کیوں؟“

”زیادہ تر تو لڈوگ پر سکون رہتا ہے۔“ فادر شینڈور نے چلتے ہوئے جواب دیا۔
 ”اور زیادہ تر وقت یہ بے ضرر بھی ہے لیکن کبھی کبھی اچانک پھٹ پڑتا ہے۔“
 ”یعنی؟“

”یعنی اس پر جنون کا دورہ سا پڑتا ہے پچھلی دفعہ جب اس پر دورہ پڑا تھا۔ تو اس نے ایک برادر پر حملہ کر کے اس کی کھوپڑی پھاڑ دی تھی۔“
 ”میرے خدا! تو وہ برادر.....؟“

”دوا بھی ہے اور ناشتہ بھی۔“ وہ بولا۔
 ”دوا اور ناشتہ!“

”جی ہاں فادر، لیکن جلد ہی یہ مختصر سا ناشتہ شکم سیر کر دینے والا ڈزین جائے گا۔“
 چارلس کو متلی ہو رہی تھی، آنتیں الٹ رہی تھیں لیکن فادر شینڈور یوں بے تعلق اور لاپرواہ رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کا لہجہ اب بھی دوستانہ اور آواز ٹھہری ہوئی تھی۔

”مجھ سے کہہ گیا ہے کہ تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔“
 ”تشریف رکھیے۔“ اس نے کہا اور حیرت انگیز قوت سے قریب رکھی ہوئی وزنی بچ گھسیٹ کر ایک طرف کر دی۔

”آپ بھی جناب تشریف رکھیے، اس نے چارلس سے کہا۔
 وہ اٹھا اور میز کا چکر لگا کر دوسری طرف آ گیا۔ اس کے جڑے اب بھی چل رہے تھے۔ اور پئی کچی مکھیوں کو پیس رہے تھے۔ چارلس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ لڈوگ کی طرف نہ دیکھے لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اول تو اس لئے کہ اس کے مضبوط جبروں کی چلتی ہوئی چکی نے، جو مردہ مکھیوں کا آٹا بنا رہی تھی اسے مسحور کر رکھا تھا اور پھر اس شخص کی آنکھوں میں کوئی عجیب قوت تھی جس نے چارلس کی نظر کو جکڑ رکھا تھا۔

”اب.....“ لڈوگ نے کہا۔ ”میں تیسری جلد کا سرورق مکمل کر چکا ہوں“
 اس کی آواز میں کامیابی کی ایسی جھلک تھی کہ چارلس کو بھی شک ہوا کہ لڈوگ کے اس اعلان پر فیبی بگل چلا اٹھیں گے اور خوشی کے شادیانے بجنے لگیں گے۔

اس نے ایک چرمی کانڈ اٹھا کر آنے والوں کے سامنے پھیلایا خود ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس پر بنائے ہوئے ڈیزائن کو تعریفی نظروں سے دیکھنے اور سر ہلا کر خود اپنے فن کی داد دینے لگا چارلس آرٹ اور فن کا نقاد نہ تھا، لیکن وہ بھی صاف عمدہ اور موتیوں

دھنسا" وہ خاموش ہو گیا، ایک قدم دروازے کی طرف بڑھا، اس کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں، اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔
 "نہیں۔ صورت حال ایسی ہے کہ ہم خانقاہ کے دروازے نہیں کھول سکتے اور کھولنے بھی نہیں چاہئیں۔ کسی کے لئے بھی نہیں۔ خواہ وہ دنیا کے دوسرے سرے سے ہی کیوں نہ آیا ہو۔"

برادر مارک نمایاں طور پر چونکا۔

"ہم جب تک اس مسئلے پر اطمینان بخش طور پر بحث اور پورے معاملے پر ہر پہلو سے غور نہیں کر لیتے تب تک ہمیں کسی اور طرف متوجہ نہیں ہونا ہے" فادر شینڈور نے کہا "اور خیال رہے کہ کوئی چیز باہر سے اندر نہ لائی جائے کسی صورت میں نہ لائی جائے۔ نہ قصداً اور نہ اتفاقاً برادر مارک! چھکڑے والے سے کہہ دو کہ ہم اس خانقاہ میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ البتہ وہ باہر جہاں چاہے قیام کر سکتا ہے۔ اس کا کھانا باورچی خانے سے بھجوا دیا جائے گا۔"

دنیا کے اس حصے میں شام کا دھندلا دھنسا چھا جاتا تھا بالکل اس طرح جیسے سمندر میں مد کے بعد فوری طور پر جزر شروع ہو جائے۔ سورج کے پہاڑیوں کے عقب میں باتے ہی اس وادی پر اندھیرے کی چادر پھیلنے لگتی جو رفتہ رفتہ سے زیادہ گہری ہونے لگتی اور ارد گرد پھیلے ہوئے جنگلات اس سرعت سے بڑھتے ہوئے اندھیرے کو اور مٹی کاڑھا کر دیتے۔

مطالعہ گاہ میں پہنچ کر فادر شینڈور نے ایک لالٹین جلائی اور اپنی میز پر رکھ دی۔
 ل طرف سے فرصت پا کر وہ دو جام اور ایک صراحی لے آیا۔

"یہ مقامی شراب ہے" فادر شینڈور نے شراب چارلس کے پیالے میں اتار دیا
 اُسے کہا "اور یہ اس علاقے کی بہترین شراب ہے۔"

"شکر ہے کہ بچ گیا۔ آؤ ابھی ہمیں بہت سے مسائل پر بحث کرنی ہے۔"

ایک خانقاہ کی گزرگاہیں گھنٹی کی آواز سے گونج اٹھیں، گھنٹہ خاموش ہو گیا اس کی آواز مدہم ہو کر ڈوب گئی۔ تو گھنٹہ پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے دو دھنکے بجایا گیا۔ چارلس نے سوچا کہ عبادت کا وقت آگیا تھا اور گھنٹے کی یہ آواز راہبوں کو عبادت کے لئے بلارہی تھی، بہر حال اسے گھنٹے کی یہ آواز بڑی ہی بے سری اور بھدی معلوم ہوئی۔
 برادر مارک جوان دونوں کے پیچھے اور چند قدم دور چل رہا تھا۔ ایک دم سے اپنی رفتار تیز کر کے آگے بڑھا اور ان کے قریب سے لکلا چلا گیا۔

چارلس اور فادر شینڈور خاموشی سے آگے بڑھتے ہوئے گزرگاہ کے اس موڑ پر پہنچ گئے جس کے عین سامنے ایک مختصر ڈیوڑھی تھی اور اس کے سرے پر اسکا بڑا بے ڈھنگا مگر مضبوط دروازہ تھا۔ برادر مارک نے اس دروازے کے قریب پہنچ کر کواڑ میں بنی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی کھولی اور دروازے کے باہر کسی سے کچھ پوچھنے لگا۔
 فادر شینڈور نے رفتار دھیمی کر دی کہ معلوم کرے برادر مارک کیا کہتا ہے اور اب چارلس نے دیکھا کہ وہ بے سری آواز گھنٹے کی نہیں بلکہ اس غیر معمولی طور پر بڑی اور زنگ آلود گھنٹی کی تھی جو دروازے کے ماتھے پر لگی ہوئی تھی۔

برادر مارک ان دونوں کی طرف گھوم گیا۔

"کیا بات ہے برادر؟" فادر شینڈور نے پوچھا۔

"باہر ایک چھکڑے والا کھڑا ہے" برادر مارک نے جواب دیا "اور وہ سہ پہر اور رات یہاں گزارنے کے لئے درخواست کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ بہت دور سے آیا ہے بے حد تھکا ہوا ہے۔"

فادر شینڈور نے کہا۔ "ہماری مسمان نوازی ضرب الشل ہے اور خانقاہ کے دروازے ہر مسافر کے لئے کھلے ہیں اور....."

اس کے بعد آپ نے یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا ہے تو۔۔۔۔۔“
چارلس نے نفی میں سر ہلایا۔

”فادر شینڈور! میں اس وقت تک یہاں سے نہ جاؤں گا جب تک کہ وہ دوزخی
نہت فنا نہیں ہو جاتا۔“

فادر شینڈور نے ”بہت اچھا“ کے سے انداز میں سر ہلایا۔ اس کے بشرے سے
اگر ہوتا تھا جیسے اسے چارلس کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا ہے۔

تاہم چارلس کو احساس ہوا کہ فادر شینڈور کو اس سے اسی جواب کی توقع تھی۔
”جیسی آپ کی مرضی“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”لیکن آپ کی بیوی کو کسی بھی حال
میں یہاں نہیں رہنا ہے۔ جب وہ سفر کے قابل ہو جائیں گی تو ہم فوراً ہی انہیں
مستقل بھیج دیں گے۔ اور وہاں وہ محفوظ ہوں گی۔ اور ہم خود ان کی طرف سے
مستقل ہو کر یکسوئی سے وہ کام کر سکیں گے۔ جو ہمیں کرنا ہے۔ ہم قصر ڈراکیولا کا گوشہ
آرام ماریں گے۔ اور وہ بھٹ تلاش کریں گے جہاں یہ عفریت آرام کرتا ہے
پھر اسے تلف کر دیں گے اور اس دفعہ کوئی ایسی لغزش نہ ہو گی جس کی وجہ سے
ان کے دوبارہ زندہ ہونے کا امکان باقی رہے۔“

لیکن ہم اس وقت قصر کی طرف کیوں نہ نہ روانہ ہو جائیں۔
”نہیں مسٹر چارلس۔“

”کیا مشکل ہے اس میں؟“

”گزشتہ رات ایک شکار کونٹ ڈراکیولا کے ہاتھ میں اگر نکل گیا ہے۔“
”کون شکار؟“

”آپ کی بیوی“

چارلس لرز گیا۔

اور انہوں نے پیالے اپنے ہونٹوں سے لگائے۔

شراب غیر معمولی طور پر تیز تھی چنانچہ اس کی تلخی چارلس نے اپنے دانتوں کی
سنجھن اور زبان پر شدت سے محسوس کی لیکن اس کے حلق سے نیچے اترتے ہی اس
کی رگ رگ میں ایک گرمی سی دوڑ گئی اور اس نے جلی خوف ایک حد تک زائل
ہو گیا جو اندھیرا اترتے ہی اس کے دل پر چھانے لگا تھا۔

چارلس نے کہا۔۔۔۔۔ ”اگر وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ ڈراکیولا آج رات اپنی قبر سے نکل آیا
۔۔۔۔۔“

”وہ زندہ ہو چکا ہے۔ مسٹر چارلس چنانچہ وہ اپنی قبر میں سے ضرور نکل آئے گا۔
اسے شکار کی تلاش ہو گی کیونکہ وہ اپنی تمام کچھلی قوتیں حاصل کرنے کے لئے بے قرار
ہو گا تاکہ وہ ایک بار پھر جب چاہے بھیڑیا یا چکاڈو بن کر خون چوس سکے۔“

”اور اگر وہ یہاں۔۔۔۔۔“

”اطمینان رکھو وہ یہاں نہیں آسکتا۔ خیر تو اب مناسب ہو گا کہ ہم اپنے عمل کا
پورا نقشہ مرتب کر لیں۔“
”فرمائیے۔“

”آپ نے کہا تھا کہ ڈراکیولا کو فنا کر دینا آپ کا فرض ہو گیا ہے۔ یا آپ اسے اپنا
فرض سمجھتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔“
”جی“

”لیکن مسٹر چارلس چونکہ میں ایک راہب ہوں اس لئے آپ کے اس جذبے
کی تعریف نہیں کر سکتا اور نہ ہی آپ کو انتقام یا سزا دینے کا مشورہ دے سکتا ہوں۔ یہ
کام انسانوں کا نہیں ہے۔ انتقام لینا اور سزا دینا خدا کے کام ہیں۔ بہر حال اب اگر
آپ پورے مسئلے پر غور کر چکے ہیں اور جان چکے ہیں کہ ڈراکیولا ایک عفریت ہے اور

”ثبوت کے طور پر یہ بات پیش کی جاسکتی ہے کہ آپ کی بیوی کو ہملا چھلا کر بلانے کے لئے اور پھر انہیں پکڑنے کے لئے اس نے خود آپ کی بھابھی کو ذریعہ بنایا جو اس عفریت کی دلسن اور ڈائن بن چکی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ خود ڈرکیولا آپ کی بیوی کو چھو چکا ہے۔ چنانچہ اب وہ اپنی ہی ملکیت یقین کر چکا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آپ کی بیوی کو حاصل کرنے کے لئے بے قرار ہوگا۔“

چارلس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ خانقاہ کی دیواریں مضبوط اور موٹی تھیں۔ ابتداء میں اسے یہ خانقاہ ایک چھوٹے سے مضبوط اور مقدس قلعہ کی طرف معلوم ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ سوچ رہا تھا اور کانپ رہا تھا کہ کیا اس کی سنگین دیواریں ڈرکیلا کو روک سکیں گی؟

”وہ..... وہ..... یہاں نہیں آئے گا؟“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
 ”اس کی امید تو نہیں؟“

”لیکن فرض کیجئے وہ یہاں آگیا تو؟“

”اگر وہ یہاں آ بھی گیا تو خانقاہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔“

اور اسے وہ تمام باتیں یاد آ گئیں جو اس نے کتابوں میں پڑھی تھیں اور سرانے بھی یاد آ گئی جس میں انہوں نے قیام کیا تھا جہاں ان کی ملاقات سے فادر شینڈلر سے پہلی دفعہ ہوئی تھی۔

”آپ کا مطلب ہے لہسن کے غنچے؟“

کے حجرے کا راستہ دکھا دوں گا۔“

اور وہ مطالعہ گاہ سے باہر نیم روشن گزرگاہ میں چل پڑے اور کچھ ہی دیر بعد ایک حجرے کے دروازے کے سامنے تھے۔

چارلس اگر ہوتا تو اس حجرے تک نہ پہنچ پاتا۔ اور اگر پہنچ جاتا تو اسے پہچان نہ سکتا تھا، کیونکہ گزرگاہیں ایک سی تھیں اور دروازے بھی ایک سے تھے۔ چارلس نے سوچا کہ اس خانقاہ میں کئی دنوں کے قیام کے بعد بھی وہ کسی خاص حجرے کو نہ پہچان سکے گا اور یہ کہ اس خانقاہ کے راہبوں کو یہاں کے راستے اور حجرے کس طرح یاد رہتے ہوں گے۔

ڈائنا کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ لیکن جب چارلس اس پر جھک گیا تو اس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں، پہلے تو وہ چونکی پھر مسکرا کر اپنی باہیں اس کی گردن میں ڈال دیں۔

”چارلس، میرے پیارے“ اس نے کہا۔

”ڈائنا!“

”تمہیں کچھ ہوا تو نہیں!..... یعنی..... اچھے ہونا؟“

”بالکل۔“ چارلس، چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

فادر شینڈور باہر ہی رک گیا تھا۔ اور وہ اپنے خیالات میں الجھا ہوا اب بھی دہن کھڑا تھا۔

”ہمیں سب سے زیادہ فکر تمہاری تھی“ چارلس نے کہا ”اور فی الحال سب سے ضروری اور اہم بات یہ ہے کہ تمہیں تندرست کر دیا جائے کہ تم لندن تک سفر کر سکو۔“

ڈائنا کا چہرہ دھک اٹھا۔

”یعنی گھر؟“ اس نے پوچھا

”ہاں۔“

میں گھر پہنچنے کے لئے اس قدر بیتاب ہوں کہ کیا بتاؤں۔ میں جلد از جلد یہاں سے رخصت ہونا چاہتی ہوں۔ وہ..... وہ..... جو کچھ ہوا ہے اس سے دور چلی جانا چاہتی ہوں۔“

اس نے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چارلس!“

”ہم“

”وہ..... وہ..... سب خواب تو نہ تھا۔ حقیقت تھی نا۔“

”ہاں ڈائنا وہ حقیقت تھی۔ کاش کہ وہ خواب ہوتا۔ لیکن ایک بار تم یہاں سے

دور چلی جاؤ گی تو پھر.....“

”ہم کب چل رہے ہیں؟“

چارلس شش و پنج میں پڑ گیا اور پھر چند ثانیوں کے توقف کے بعد بولا۔

”ہم نہیں، صرف تم۔“

”کیا مطلب؟“

”ڈائنا! میں تمہارے ساتھ نہ جاؤں گا۔ کم سے کم فی الحال نہ جاسکو گا۔“

”کیوں؟“

”یہاں مجھے ایک اہم فرض انجام دینا ہے۔“

”تم وہاں اس منحوس قصر میں دوبارہ تو نہیں جا رہے؟“ ڈائنا نے تقریباً چیخ کر

پچھا۔

”میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے ڈائنا۔“

دوڑ کر ڈانٹا کے پاس جائے اور اسے اپنے سینہ سے لگا لے
 ”ہاں ہوگی، لیکن ساتھ ہی ساتھ میں سمجھتا ہوں وہ ایک وقار اور فرماں بردار
 بیوی بھی ہے۔“

چارلس نے اثبات میں سر ہلادیا۔
 ”میری مانیجے اور آج آپ بھی جلد ہی سو جائیے۔“ فادر شینڈور نے بات کو گویا
 لٹھام تک پہنچاتے ہوئے کہا۔

”آپ بہت زیادہ تھکے ہوئے ہیں چاہے خود آپ کو اس کا احساس نہ ہو۔“
 ”احساس کیوں نہیں ہے فادر؟ لیکن۔۔۔۔۔۔“

”آپ فکر نہ کریں اور اطمینان سے سو جائیں۔ بے فکر ہو کر۔ ہمارے دروازے
 مضبوطی سے بند ہیں۔ آپ اور آپ کی بیوی محفوظ ہیں۔“
 ”آج رات کوئی دشمن اس خانقاہ میں قدم نہ رکھ سکے گا۔“

باہر رات کی دھند پھیل چکی تھی۔ خانقاہ کی کمریوں کے شیشے بھی دھندلا گئے
 تھے۔ ایک کمری کے شیشے پر بھوری بھوری انگلیاں رینگ رہی تھیں، کوئی باہر کھڑا
 کمری کے شیشے کو ناخنوں سے یوں کھرچ رہا تھا، جیسے وہ شیشہ نہیں کاغذ ہو۔ کچھ دیر کی
 ناکام کوشش کے بعد وہ بھوری انگلیاں شیشے پر سے ہٹ گئیں۔
 خانقاہ کے دروازے اور کمریاں مضبوطی سے بند تھیں۔
 چنانچہ خوف کی کوئی بات نہ تھی۔



”نہیں۔ نہیں۔ میں تمہیں وہاں نہ جانے دوں گی چارلس تم وہاں نہ جاؤ گے۔“
 ”اس کے متعلق ہم کل صبح تفصیل سے گفتگو کریں گے۔“

”نہیں۔ کل نہیں۔ اسی وقت اور ابھی۔“
 چارلس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ڈانٹا اس سے لپٹ گئی۔

”نہیں۔ میں تمہیں نہ چھوڑوں گی۔“ وہ بولی۔ ”اس وقت تک نہیں جب تک
 کہ تم وعدہ۔۔۔۔۔۔“

عین اسی وقت فادر شینڈور حجرے میں آگیا۔
 ”مسز کینٹ! آپ زیادہ نہ بولیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کو مکمل آرام کرنا

چاہئے۔ یہ بے حد ضروری ہے۔“
 ”فادر انہیں سمجھائیے۔ خدا کے لئے بتائیے انہیں کہ وہاں جانا پاگل پن ہے۔“

فادر شینڈور، چارپائی کے قریب آکھڑا ہوا۔ اس نے مسکرا کر ڈانٹا کے ہاتھ پر اپنا
 ہاتھ رکھ دیا۔

”مسز کینٹ! آپ کے شوہر نے یہ ٹھیک ہی کہا ہے۔ اس کے متعلق ہم کل
 گفتگو کریں گے۔“

”اس نے چارلس کو چارپائی پر سے اٹھایا۔ اور ہاتھ پکڑ کر اسے حجرے سے باہر
 لے آیا۔ ڈانٹا نے ان دونوں کو آوازیں دیں۔ لیکن وہ تڑھال ہو کر ڈھے گئی۔

باہر آکر فادر شینڈور نے دروازہ بند کر دیا اور کہا۔
 ”کل صبح وہ ٹھیک ہو جائیں گی اور اس وقت ہم انہیں سمجھا سکیں گے کہ ہمیں کیا

کرنا ہے۔“
 ”وہ بڑی ضدی عورت ہے فادر۔“ چارلس نے کہا۔

اور یکایک اس کے دل میں اپنی بیوی کی محبت کی ایسی لہر اٹھی کہ اس کا جی چاہا کہ

دی تھی یا یہ آواز اس کے پریشان دماغ میں پیدا ہوئی تھی۔
پھر وہی آواز سنائی دی۔

شاید بلکہ یقیناً درختوں کی ٹہنیاں ہوا کے جھونکوں کی تاب نہ لا کر دیوار سے ٹکرا رہی تھیں۔ بارش کے قطروں کی بوچھاڑ خانقاہ کی نیچی چھت پر بج رہی تھی، باہر طوفان باد باراں زوروں پر تھا۔

اب تین دفعہ دستک دی گئی۔

آواز صاف اور واضح تھی۔ اب کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی یہ اس کا وہم نہ تھا۔ حقیقت میں کوئی دستک دے رہا تھا۔

ڈانٹا ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔

کھڑکی کے شیشے اندر سے دھندلا گئے تھے اور باہر دھند منڈلا رہی تھی لیکن کھڑکی کے باہر اور اس کے شیشے سے چپکا ہوا چہرہ اسے صاف نظر آرہا تھا

ہیلن کا بگڑا ہوا، کرناک اور ہلچلی چہرہ۔

ڈانٹا کانپ گئی۔ وہ جہاں تھی وہیں بیٹھی رہی۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی جرات نہ کر سکی۔ وہ چیخا چاہتی تھی لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل رہی تھی۔

”رحم کرو۔“ ہیلن کے ہونٹ ہلے۔

ڈانٹا بت بن گئی۔

”رحم کرو“ ہیلن ایسی آواز میں التجا کر رہی تھی جو بمشکل سنی جاسکتی تھی۔

ڈانٹا نے اپنی ٹانگیں نیچے لٹکادیں۔ وہ بستر میں سے نکل آئی۔ لیکن جیسے ہی اس کے پیروں نے حجرے کی سنگین اور ٹھنڈے فرش کو چھوا کہ اس کے رگ و ریشے میں برفانی خوف سرایت کر گیا اور اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر حجرے سے نکل جائے اور

باب-۸

پناہ گاہ قید خانے میں تبدیل ہو گئی۔ دیواریں ایک دم سے جھک آئیں۔ وہ اسے پینے کے لئے آگے بڑھ رہی تھیں اور ڈانٹا اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کچھ جاگنے کے عمل میں تھی اور کچھ نیند میں تھی اور اسی عالم میں اس نے یوں محسوس کیا۔ جیسے وہ قعر ڈرکولا میں ہے کوئی اسے گھیر کر ایک کونے میں لے آیا ہے اور کوئی ایسی چیز جس کا چہرہ نہیں ہے۔ اپنے بڑے بڑے بازو پھیلائے، اس کی طرف آ رہی ہے اس پر حملہ آور ہو رہی ہے۔ اس چیز کا چہرہ نہ تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ اس چہرے کے ظالمانہ نقوش کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھی دو خونخوار بچے اس کی حلق کی طرف بڑھے اور دیوانہ وار اپنے دونوں ہاتھ چلا کر ان بچوں کو پیچھے ہٹانے لگی۔

لیکن یہ صرف خواب تھا۔ کبل کا صرف ایک کونہ اس کے ایک گال سے رگڑ کھا رہا تھا۔ اور جب اس نے ہاتھ چلائے تو کبل اس کی مٹھی میں تھا اس نے کبل اپنے اوپر سے گھسیٹ لیا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں اور ایک منٹ تک حجرے کی نیچی چھت کی طرف دیکھتی رہی وہ اپنے بے وجہ خوف پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ کیا حماقت تھی؟ حماقت تو نہیں البتہ عجیب بات ضرور تھی اس کا دل کیوں دھڑک رہا تھا حالانکہ اس خانقاہ میں وہ محفوظ تھی اور اس دوزخی ہستی کی دست سے باہر جس سے قعر ڈرکولا میں اس کا سابقہ پڑ چکا تھا۔

دستک کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

ڈانٹا بے حرکت پڑی رہی وہ یقین سے کہہ نہ سکی تھی کہ واقعی کسی نے دستک

گئی۔ چنٹی کل گئی تو وہ دستہ پڑ کر کھڑی ایک پٹ کھولنے لگی۔ آہستہ آہستہ ہچکچاتے ہوئے

ہوا کا ایک تیز جھوٹا اندر کھس آیا۔ اس میں استرے کی سی کاٹ تھی اور کھڑکی کھلتے ہی گاڑی دھند کی وحشتناک زندہ چیز کی طرح اچک کر اندر در آئی ہیلن کے ہونٹ اس کے دانتوں پر کھنچ گئے۔ وہ احساسِ فتح مندی سے ہوٹے ہوئے غرارہی تھی۔ دھند کے مرغلوں میں سے دو ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے نکل آئے اور دوسرے ہی لمحے ڈانٹا کی کلائی ایک آہنی گرفت میں تھی۔ یہ ہیلن تھی جس نے اس کی کلائی پکڑ لی تھی اور اس کی یہ پکڑ بڑی بیدردانہ تھی۔ ڈانٹا نے اپنی کلائی اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اس نے چاہا کہ وہ پیچھے ہٹ کر اپنے حجرے کے انتہائی سرے پر پہنچ جائے۔ وہاں وہ محفوظ ہوگی۔ لیکن ہیلن نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور اب اس کا سر تیزی سے جھکا اور اس کے دو تیز اور لالچے اور ٹیکلی دانت ڈانٹا کی کلائی میں گڑ گئے۔

ڈانٹا دو دو تکلیف اور خوف سے چیخ پڑی۔ فوراً ہی ہیلن نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر غائب ہو گئی لیکن دوسرے ہی لمحے کھڑکی کے چوکھٹے میں ایک اور چہرہ جڑا نظر آیا۔ لبوتر، کھنچا ہوا، اور بھیانک چہرہ۔ کوئٹ ڈرنگولا۔۔۔۔۔ اور اس نے اپنے دونوں بچے پھیلائے اور سرخ دھاری دار اور سیاہ لبوے کے دونوں کونے پکڑ کر اسے یوں اٹھا رکھا تھا جیسے وہ ڈانٹا کو اپنی دم گھونٹ دینے والی آغوش میں سمیٹ لے گا۔

ایکایک ڈانٹا کی پشت کی طرف سے ایک دھاڑ کی آواز سنائی دی اور حجرے کا دروازہ کھل گیا ڈرنگولا تیزی سے پیچھے ہٹا اور دیکھتے اندھیرے میں غائب ہو گیا بالکل اسی طرح جس طرح ڈکاری پرندہ کوئی غیر متوقع آواز سے گھبرا کا اور اپنا شکار

چارلس کے پاس پہنچ جائے۔

لیکن وہ ایسا نہ کر سکی اس کے قدم فرش میں گڑے گئے۔ ہیلن کھڑکی کے شیشے پر اپنے بچے چلا رہی تھی اور دیوانوں کی طرح جلدی جلدی اور عجیب عجیب منہ بنارہی تھی۔ ڈانٹا نے اپنے آپ کو بوکنا چاہا لیکن روک نہ سکی جیسے وہ اپنی مرضی کی مالک نہ رہی تھی۔

ڈانٹا کے قدم بے اختیار کھڑکی کی طرف اٹھ گئے۔

ہیلن کے چہرے کا رنگ حیرت انگیز حد تک سفید تھا جیسے اس کے بدن میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ رہا ہو اور اس کے بشرے سے عجیب طرح کا کرب اور بھوک عیاں تھی۔

ڈانٹا کھڑکی کے قریب پہنچ چکی تھی چنانچہ اس کی آواز سن سکتی تھی۔

”ڈانٹا! رحم کرو میرے حال پر۔ مجھے اندر آنے دو۔ باہر بہت زیادہ سردی ہے۔

میں ٹھہر رہی ہوں ڈانٹا۔ رحم کرو مجھ پر“

ڈانٹا شش و پنج میں پڑ گئی۔ اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا کاش کہ چارلس وہاں آجاتا۔ کاش کہ فادر شینڈور کہیں قریب ہی ہوتے اور پھر وہ فیصلہ کرتے کہ کھڑکیاں کھولی جائیں یا نہیں۔

”ڈانٹا! میری اچھی بہن۔ میں درخواست کرتی ہوں۔“ ہیلن کا چہرہ انتہائی مایوسی کے عالم میں شیشے سے چپک گیا تھا۔ گھبراؤ نہیں ڈانٹا۔ اب سب ٹھیک ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں وہاں سے بھاگ آئی ہوں رحم کرو ڈانٹا۔ مجھے اندر آنے دو میں ٹھہر رہی ہوں اور پھر۔ پھر۔۔۔ اگر وہ۔۔۔ میرا تعاقب کرتا ہوا یہاں آگیا اور مجھے پکڑ کر لے گیا تو پھر کوئی مجھے اس کے بچے سے چھڑانہ سکے گا۔“

ڈانٹا نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور چنٹی نیچے سرکانے

چارلس نے ڈانکا کا ہاتھ پکڑ کر فادر شینڈور کی طرف لمبا کر دیا اور اسے اس طرح موڑ دیا کہ کلائی پر دونوں سوراخ اور ان میں سے قطرہ قطرہ نکلتا ہوا خون اوپر آگیا۔ فادر شینڈور نے اپنے بائیں ہاتھ سے ڈانکا کی انگلیاں ایسی مضبوطی سے پکڑ لیں کہ وہ انہیں ہلا بھی نہ سکتی تھی۔ اب اس نے وہ لیپ جسے وہ دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ ڈانکا کی کلائی پر جھکا دیا یہاں تک کہ اس پر چڑھا ہوا اور لپٹا ہوا شیشہ ڈانکا کی کلائی پر کے سوراخوں سے چھو گیا۔

درد و تکلیف کی آتش لہر اس کی کلائی سے اٹھی اور اس کے بازو میں سے گرزتی ہوئی پورے بدن میں دوڑ گئی۔ وہ سر سے پیر تک جیسے اندر ہی اندر جل اٹھی۔ وہ چیخ اٹھی اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن چارلس نے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا اور پھر فادر شینڈور جیسے طاقت ور آدمی کو جھٹک دینا ممکن بھی تو نہ تھا۔

یہ جلتا ہوا درد ختم ہونا چاہئے..... اسے روک دینا چاہئے..... وہ گیلی لکڑی کی طرح اندر ہی اندر سنگ رہی تھی..... اس کا خون دہکتے ہوئے لاوے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی ہڈیاں پھٹک رہی تھیں۔ اس کا دماغ دھلکا ہوا انگارہ بن چکا تھا..... اس کے دل کو اٹیشیسی پر بھونا جا رہا تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکتی تھی..... چنانچہ مسلسل چیخ رہی تھی۔

”خدا کے لئے فادر!“ چارلس بے قابو ہو کر چلایا۔ ”لیس اب بہت ہو گیا“

فادر شینڈور نے ڈانکا کی کلائی پر سے لیپ اٹھالیا۔ درد کی لہروں میں کمی واقع ہو گئی۔ لیکن جلے ہوئے گوشت پر ٹھنڈی ہوا کا اثر یہ ہوا کہ تکلیف کی شدت دہنی ہو گئی۔ ڈانکا کراہ کر پیچھے کی طرف ڈھے گئی۔ اس کی اعضا ڈھیلے پڑ گئے۔ تاہم اسے اتنا ہوش ضرور تھا کہ وہ یوں محسوس کر رہی تھی کہ کوئی اسے آہستہ سے اٹھا کر بستر پر لٹا رہا

چھوڑ کر پرواز کر جاتا ہے۔

ڈانکا پیچھے کی طرف جھونک کھا گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ گر رہی تھی لیکن فوراً ہی دونوں ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔

یہ چارلس تھا جو سارا دے کر اسے چارپائی کی طرف لئے جا رہا تھا۔

”کیا ہوا فادر شینڈور کی آواز سنائی دی۔“

”ڈانکا کو کچھ دھندلا سا احساس ہوا کہ فادر شینڈور حجرہ عبور کر کے کھڑکی کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی بند کر کے چٹختی لگادی، چارپائی کے قریب آیا اور ڈانکا پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ چارلس نے احتجاج کیا فادر شینڈور نے اسے ایک طرف ڈھکیل دیا۔ ڈانکا کے دونوں شانے پکڑ لئے اور بڑے غصے کے عالم میں اسے جھنجھوڑنے لگا۔“

”بتاؤ کیا ہوا؟“ بتاؤ“ اس نے کڑک کر پوچھا۔

ڈانکا نے بے بسی سے اپنے ہاتھ چارلس کی طرف پھیلا دیئے۔ موخر الذکر بے اختیار اس کی طرف بڑھا لیکن پھر فوراً ہی اس کے قدم رک گئے اور اس کا خون سرد ہو گیا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈانکا کی اس کلائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس پر دو چھوٹے سے سوراخ تھے۔ فادر شینڈور نے بھی ڈانکا کے ہاتھ پر دونوں سوراخ دیکھ لئے۔

”خدا یا!“ وہ غرایا ”مسٹر چارلس! پکڑے رہو۔ انہیں۔“

فادر شینڈور نے ڈانکا کو چھوڑ دیا۔ وہ آزاد تھی۔ فوراً ہی چارلس نے آگے بڑھ کر اپنا بازو اس کی کمر میں ڈال دیا۔ فادر شینڈور نے وہ لیپ اٹھالیا جو ایک کونے میں میز پر رکھا جل رہا تھا۔

”جی ہاں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ۔۔۔“
 ”ہم۔۔۔ ہمیں پہلے ہی سمجھ لیتا چاہئے تھا“ قادر شینڈور نے جلدی سے کہا۔ اور
 چارلس کی طرف گھوم گیا ”آئیے میرے ساتھ۔“
 چارلس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

”آپ ان کی فکر نہ کریں۔“ قادر شینڈور نے چارلس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا
 تھا۔ ”برادر مارک لن کا کلائی پر پٹی کس دیں گے اور اسی حجرے میں رہیں گے۔“
 ایک بار پھر ڈانٹا اپنے ہاتھ بڑھا کر چارلس سے لپٹ جانا چاہتی تھی وہ چاہتی تھی
 کہ اس کا شوہر اس کے قریب ہی رہے۔ لیکن وہ تو قادر شینڈور کے ساتھ جا رہا
 تھا۔۔۔ اور وہ دونوں چلے گئے۔ خاموش گزر گاہ میں سے ان کے پیروں کی چاپ کچھ
 دیر تک سنائی دیتی رہی اور پھر دور ہو کر ڈوب گئی۔

ڈانٹا نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی نگاہیں برادر مارک کی پر خلوص ہمدرد اور
 ساتھ ہی ساتھ شکر نگاہوں سے کھرائیں۔
 ”میں بیٹھنا چاہتی ہوں“ مرودہ آواز میں کہا۔

فوراً ہی برادر مارک نے آگے بڑھ کر اپنی دونوں ہتھیلیاں اس کے شانوں کے
 نیچے لٹکائیں اور اس طرح سہارا دے کر اسے آہستہ سے اٹھا کر بٹھا دیا۔ ”اس طرح
 بٹی کس نے میں بھی آسانی ہوگی۔“ برادر مارک پٹی کس چکا تو اس کے بعد بھی وہ بیٹھی
 رہی۔ وہ لیٹنا نہ چاہتی تھی، وہ سونانہ چاہتی تھی۔۔۔ وہ جاگنا اور بیٹھے رہنا چاہتی تھی
 کہ خواب پریشوں کی وہ بھیاں صورت اسے پھر نظر نہ آئے وہ۔۔۔ وہ عفریت کھڑکی
 میں پھر نمودار نہ ہو۔

ڈانٹا خاموش تھی تاہم برادر مارک سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ چنانچہ وہ حجرے کے
 انتہائی سرے پر رکھی ہوئی ایک کرسی میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ گود میں

تھا اور پھر وہ قادر شینڈور کی آواز بھی سن رہی تھی جو بہت دور سے آتی ہوئی معلوم
 ہوتی تھی۔ کہیں گمرانیوں میں سے آ رہی تھی۔

”برادر مارک! مرہم لگا کر پٹی کس دو“ قادر شینڈور کہہ رہا تھا۔
 اور چارلس قریب ہی تھا۔ بہت قریب۔ وہ شاید اس پر جھکا سرگوشی میں کچھ کہہ
 رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنی باہیں چارلس کی گردن میں ڈال دے لیکن وہ ایسی ممکن
 محسوس کر رہی تھی کہ انگلی تک نہ ہلا سکتی تھی اور پھر اس خیال سے خوف زدہ بھی تھی
 کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا ذرا سی حرکت اس دوزخی تکلیف کی لہروں کو اس کے جسم
 میں ایک بار پھر دوڑا دے۔

”شکر ہے کہ ہم عین وقت پر پہنچ گئے۔“ قادر شینڈور نے کہا۔
 قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ ڈانٹا نے اپنی کلائی پر ٹھنڈک سی محسوس کی۔
 کوئی ٹھنڈی چیز اس کی کلائی پر چڑی جا رہی تھی۔ کچھ لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ
 ٹھنڈی چیز اس کی کلائی پر سرد آگ کی طرح سلگ اٹھی چند سیکنڈ تک یہ سرد آگ
 ناقابل برداشت رہی اور پھر اس نے درد کی ٹیسوں کو ماند کر دیا۔ برف آگ سے دست
 و گریباں تھی۔ ڈانٹا نے کچھ اور سوچنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی جسم کے دوسرے اعضاء
 کی طرف متوجہ ہونا چاہتی تھی لیکن اس بازو میں دھڑکتا ہوا درد اسے کسی اور طرف
 متوجہ نہ ہونے دیتا تھا اور دوسرے تمام احساسات پر غالب تھا۔

”خانقاہ میں مسافر تو مقیم نہیں ہیں؟“ قادر شینڈور پوچھ رہا تھا۔
 ”خانقاہ میں کوئی مقیم نہیں ہے“ قادر ”برادر مارک نے جواب دیا۔ خود آپ ہی کا
 حکم تھا کہ کسی کو بھی خانقاہ میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ لیکن ایک چمکڑے والا چہاں
 آیا تھا۔ وہ خانقاہ سے باہر مقیم ہے۔ اس کے لئے کھانا بھیج دیا گیا ہے۔“
 ”چمکڑے والا!“ قادر شینڈور چونکا۔

رکھے کسی خیال میں غرق تھا۔ ڈانٹا جانتی تھی کہ اگر اس نے بولنا چاہا تو برادر مارک فوراً اس سے مصروف گفتگو ہو جائے گا اور اسے تسلی دے گا۔ لیکن اس وقت وہ کچھ کہنا نہ چاہتی تھی۔ وہ سکون اور خاموشی چاہتی تھی اور..... برادر مارک بھی خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

دروازے پر کسی نے ناخن گھسے اور ”خرر... خرر“ کی ایک ہلکی سی آواز نے خاموشی کے اس سحر کو توڑ دیا۔ برادر مارک چشم زدن میں کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔



ایک اجازت صورت اور وحشت ناک آنکھوں والا شخص دروازے میں کھڑا ہوا۔ وہ کچھ کھڑا تھا اور کچھ سنا ہوا تھا یوں سمجھئے کہ وہ اس کتے کی طرح دبکا ہوا تھا جس کی پیٹھ پر پڑنے کے لئے آقا کا ڈنڈا بلند ہو چکا ہو۔ لیکن ڈانٹا کو وہ اس بھیڑیے کی طرح معلوم ہوا جو شکار پر یا دشمن پر جھپٹنے کے لئے اپنا بدن گھسیٹ چکا ہو۔

”لڈوک! تم“ برادر مارک کے لہجے سے حیرت ظاہر تھی ”تم اپنے حجرے سے باہر دریاں کیا کر رہے ہو؟“

”میرے حجرے کو ایک اہم کام کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔“ لڈوک نے جواب دیا۔

”اور پھر اس نے برادر مارک کے کندھوں پر سے اپنی نظر گزار کر ڈانٹا کی طرف دیکھا۔ لڈوک کی آنکھوں سے بے پروائی اور عیاری کے طے جلتے جذبات جھانک رہے تھے۔“

”مادام!“ وہ بولا ”فادر شینڈور نے آپ کو سلام کہا ہے اور اپنی مطالعہ گاہ میں آپ کو طلب کیا ہے۔ تشریف لائیے۔“

”لیکن مجھے ہدایت کر دی گئی ہے کہ..... برادر مارک نے احتجاج کرتے ہوئے

کہنا شروع کیا۔

لڈوگ نے کسی بادشاہ کی طرح بڑی شان سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا دیا ڈانٹا اس شخص کے درجے اور مقام سے واقف نہ تھی اور نہ جانتی تھی کہ یہ شخص جس کا نام لڈوگ تھا، خانقاہ میں کیا تھا البتہ اتنی بات تو وہ بھی دیکھ سکتی تھی کہ اس نے برادر مارک کو گڑبڑا دیا تھا اس کے علاوہ اس کی ایک ایک حرکت سے تحکمانہ شان عیاں تھی۔ چنانچہ ظاہر ہوا کہ اس شخص کو خانقاہ میں کوئی بلند مقام حاصل تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر ہاتھ بڑھا کر کھوٹی پر سے اپنا چنہ کھسٹ لیا اور لڈوگ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

”برادر! حالات پر قابو حاصل کر لیا گیا ہے“ لڈوگ نے کہا۔ چنانچہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اور اس سے پہلے کہ برادر مارک کچھ کہہ سکتا یا سننے سے بحث کا آغاز کر سکتا لڈوگ ڈانٹا کو دھکیل کر نہ صرف گزر گاہ میں لے آیا تھا بلکہ اسے آگے لئے جا رہا تھا۔ گزر گاہ میں آتے ہی ڈانٹا کو پھریری آگئی اور اس کا جی چاہا کہ وہ لوٹ جائے لیکن لڈوگ یوں تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا جیسے وہ ڈانٹا کو وہاں پہنچا کر جہاں اسے پہنچانے کا حکم ملا تھا۔ اس فرض سے جلا از جلد سبکدوش ہو جانا چاہتا ہو۔ اور ڈانٹا سوچ رہی تھی کہ خدا جانے کیا ہوا تھا اور اس کے شوہر اور قادر شینڈور کو خدا جانے کون سی نئی بات معلوم ہوئی تھی کہ انہوں نے اسے بلا بھیجا تھا۔

آگے آگے چلتا ہوا لڈوگ ایک دروازے کے قریب آکر رک گیا۔ گردن گھما کر پیچھے آتی ہوئی ڈانٹا کی طرف ایک نظر دیکھا۔ دروازے پر دستک دی اور جواب کا انتظار کئے بغیر اسے کھول کر ایک طرف ہٹ گیا کہ ڈانٹا اندر داخل ہو جائے۔ ڈانٹا حجرے میں داخل ہو گئی۔

بے شک یہ قادر شینڈور کی مطالعہ گاہ ہی تھی۔ کتابوں کی الماریاں کمرے کی دیواروں کے نیچے پن کو ڈھانپ رہی تھیں، سامنے میز بھی تھی۔ پالش کی ہوئی، صاف اور چمکدار اور یہ چیزیں اس کمرے کو خود اس کے حجرے سے زیادہ قابل قبول بنا رہی تھیں۔

لیکن اس کمرے میں قادر شینڈور نہ تھا۔ کوئی نہ تھا۔

اس نے اپنی پشت کی طرف سے دروازہ بند ہونے اور پھر قفل لگنے کی ہلکی سی آواز سنی۔ وہ ایک دم سے دروازے کی طرف گھوم گئی۔

لڈوگ غائب تھا۔ وہ اس کے ساتھ کمرے میں نہ آیا تھا۔ لیکن بند دروازے سے ٹپک لگائے کوئی اور کھڑا بھوکی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہی۔ وہی۔۔۔۔۔ کونٹ ڈر کیولا۔

شدید خوف اس کے دل کی گہرائیوں میں سے اٹھا اور اس کے بڑے بڑے بلبلے اس کے حلق میں آکر پھنس گئے، اس سے پہلے کہ وہ چیخ کر ان بلبلوں کو پھوڑ دیتی، ڈر کیولا نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا دیا اور اپنے خوفناک پنجہ سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ڈر کیولا کی آنکھیں یوں جل رہی تھیں جیسے ان کے پیچھے دوزخ کے شعلے سلگ رہے ہوں۔

ڈانٹا کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ ان جلتی ہوئی بھینک آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی کہ کسی دم میں وہ گر پڑے گی۔ آنکھوں کے جلتے ہوئے ان دوزخی گڑھے میں جا پڑے گی۔ ڈر کیولا کی شیطانی آنکھوں کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ آگے۔ آگے۔ آگے۔۔۔۔۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہی وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلی تھی اس کے باوجود یہ عجیب بات تھی کہ وہ ڈر کیولا کی طرف کھینچ رہی تھی۔ یا یہ شاید اس کی روح تھی جو کھینچ رہی تھی وہ اسی جگہ کھڑی ہوئی

کارنگ زردی مائل سفید تھا۔

ڈریکولانے اپنے ایک ہاتھ کی چھنگلا کے لائے اور تیز ناخن سے اپنے ننگے سینے پر اوپر سے نیچے تک ایک لکیر کھینچ دی اور پھر ایک جگہ جہاں انسان کا دل ہوتا ہے۔ جھنگلا کا یہ تیز اور لانا ناخن جڑ تک ڈریکولا کے سینہ میں اتر گیا۔

اس سوراخ میں سے خون نکل آیا۔

ڈریکولانے دوسرا ہاتھ بڑھا کر ڈانٹا کا ایک ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنی طرف کھینچا ڈانٹا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد نہ کی وہ بڑی فراہم داری سے کچنی چلی آئی، ڈریکولانے اس کا ہاتھ چھوڑ کر ڈانٹا کی گردن پکڑ لی اور اب وہ اس کے سر کو آہستہ آہستہ نیچے جھکا رہا تھا۔ اپنے سینہ پر اور اپنے سینے پر کے اس سوراخ پر جس سے خون رس رہا تھا۔

ڈانٹا کا سر اس کے سینہ پر جھک گیا۔ اس نے ڈریکولا کا خون دیکھا تقریباً سیاہ اور دھشتا ڈانٹا کی پیاس بھڑک اٹھی وہ اس خون کا مزہ چکھنے کے لئے بیتاب ہو گئی۔ لیکن وہ سحر ٹوٹ چکا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ چنانچہ ڈریکولا کی جلتی ہوئی آنکھوں کے اثر سے وہ آزاد ہو چکی تھی، وہ چونکی اسے ہوش سا آگیا اور اب وہ ڈریکولا کی بے دردانہ گرفت سے آزاد ہونے کے لئے دیوانہ وار جدوجہد کر رہی تھی۔ ڈریکولا اس دردندے کی طرح غرایا جو دوپچے ہوئے اپنے شکار کو چھوڑنے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہو اس نے جلدی سے ڈانٹا کی گردن چھوڑ کر اس کے بال پکڑ لئے اور اس کے سر کو جبرا اپنے سینے پر اور اس خون کے رستے ہوئے سوراخ پر جھکانے لگا۔

ڈانٹا بے تحاشہ ہاتھ چلا رہی تھی وہ ڈریکولا کے سینے پر گھونے چلا رہی تھی۔ اور کوشش کر کے وہ آخر کار اپنا سر ڈریکولا کے سینے پر سے اتار اٹھانے میں کامیاب ہو گئی کہ چیخ سکے اور ڈانٹا کی ٹلک شکاف چیخ مطالعہ گاہ میں گونج گئی۔ اور اس چیخ کا جواب

تھی اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو ڈریکولا کی آغوش میں محسوس کر رہی تھی۔ وہ دونوں دور دور کھڑے ہوئے تھے۔ تاہم وہ اس غفریت کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ زیادہ سے زیادہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔

ڈریکولا مسکرایا۔ اس کا اوپری ہونٹ غیر قدرتی انداز میں اوپر چڑھ گیا وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ ڈانٹا کی طرف اور اسے ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے اس کے باوجود وہ ڈریکولا کی آرزو کر رہی تھی وہ خوفزدہ تھی لیکن ڈریکولا کے سینے سے لگ جانا چاہتی تھی۔ ڈریکولانے اپنا پتلا ہاتھ اٹھایا۔ وہ ڈانٹا کے حلق کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

ڈانٹا نے ڈریکولا کا یہ حکمانہ اشارہ کچھ دیکھا اور کچھ نہ دیکھا کیونکہ اس کی نظر کو ان دو جلتی ہوئی آنکھوں نے اب بھی جکڑ رکھا تھا وہ اب بھی دونوں کے اس کھنڈوں میں مسور سی جھانک رہی تھی ایک بار پھر ڈریکولانے اپنا ہاتھ اٹھا کر اور ڈانٹا کی نظروں کے سامنے ہلا کر اس کے حلق کی طرف اشارہ کیا۔ اور اس دفعہ وہ سمجھ گئی، ڈانٹا کا ہاتھ اپنے آپ یعنی ڈانٹا کی مرضی سے نہیں۔ آہستہ آہستہ اوپر اٹھا۔ خود اس کے حلق کی طرف، اس نے گریبان پکڑ لیا۔ اس نے ایک معمولی سا جھٹکا دیا اور گریبان ”چر“ سے پھٹ گیا ڈانٹا کا حلق اب کھلا تھا۔ اس کا ہاتھ حلق پر رینگنے لگا اور اس کی انگلیوں نے اس ڈوری کو گرفت میں لے لیا۔ جو اس کی، ڈانٹا کی، گردن میں پڑی ہوئی تھی۔ اس ڈوری سے ایک چھوٹی سی سنہری صلیب لٹک رہی تھی ڈانٹا کے ہاتھ نے گردن میں سے ڈوری کی گرہ کھول دی اور پھر اس نے وہ ڈوری مع سنہری صلیب کے ایک طرف پھینک دی۔

ڈریکولا مسکرایا۔

اپنی نظر کے سحر سے ڈانٹا کو آزاد کئے بغیر ڈریکولانے اپنا گریبان ایک ہاتھ سے پکڑ کر نیچے تک پھاڑ دیا اور اب اس کا سینہ عریان تھا پسلیوں پر منڈھی ہوئی جھلی کی سی جلد

پاسکے گا۔ عمر بھر ملکوں ملکوں کی خاک چھاننے کے باوجود اسے تلاش نہ کر سکے گا اور کبھی بھی تلاش نہ کر سکے گا۔

”چارلس!“ اس کا دل پکار اٹھا۔

لیکن چارلس وہاں نہ تھا اور وہ ڈریکولا تھا جس نے اسے اٹھا رکھا تھا اور وہ اندھیری رات میں تیزی سے بھاگ رہا تھا اتنی تیزی سے کہ معلوم ہوتا تھا کہ پرواز کر رہا ہو اور یہ غفریت ڈانٹا کو اس دوزخ کی طرف لئے جا رہا تھا۔ جس کا نام ”زندہ مردوں کی دوزخ“ ہے جو بھیانک اور خون چوسنے والے ویپرائوں کی دنیا ہے۔



ڈریکولا کی ایک اور غراہٹ نے دیا۔

”ڈانٹا۔ آ۔ آ۔“

ایک آواز، ایک پکار مطالعہ گاہ کے کواڑوں کی جھریوں میں سے اندر گھس آئی چارلس کی آواز، بیشک یہ چارلس کی آواز تھی لیکن بہت دور سے آئی تھی گزر گاہ کے انتہائی سرے پر۔

ڈانٹا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوششیں تیز کر دیں آخر وہ اپنے آپ کو چھڑا کر دروازے تک بھاگ سکتی۔ اگر وہ کچھ دیر کے لئے اپنا منہ اس گھٹاؤ نے خون رستے زخم سے دور رکھ سکتی، اگر وہ چند منٹ کے لئے ڈریکولا۔۔۔۔۔

کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کا چھٹکا سنائی دیا۔ ڈریکولا نے اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی۔ اس نے ڈانٹا کے بال نہ چھوڑے، بلکہ وہ اسے لئے لئے کھڑکی طرف گھوم گیا۔

کھڑکی کے فریم میں لڈوگ کا چہرہ جڑا ہوا تھا۔ وہ ڈریکولا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے اشارے سے ڈریکولا کو اس طرف آنے کو کہا اور پھر اپنی کھٹی سے بقیہ شیشہ بھی توڑ دیا۔

ڈریکولا کا ایک زور دار گھونہ ڈانٹا کے سر پر پڑا، اس کا بھیجا بل گیا۔ بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے اور پھر ان نے محسوس کیا کہ ڈریکولا اسے اپنی باہوں میں اٹھا رہا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگا اور اپنے ہاتھوں پر ڈانٹا کو سنبھال کر اس نے کھڑکی کی طرف چھلانگ لگادی۔ جتنا کچھ شیشہ ٹوٹنے سے بچ رہا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔

ڈریکولا، ڈانٹا سمیت باہر نکل چکا تھا۔

ایک بار پھر وہی بھیانک خواب پریشان ڈانٹا پر قبضہ جما چکا تھا چارلس اسے چھوڑ چکا تھا۔ بھول چکا تھا یا شاید اس تک پہنچنے میں ناکام رہا تھا اور اب وہ ڈانٹا کو کبھی نہ

بستر بچھا ہوا تھا۔ فادر شینڈور نے دوسری صلیب اس تابوت میں رکھ دی۔
 ”پھکڑے والا“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”شاید وہی وفادار کلیو ہوگا بشرطیکہ ہم اس کی
 غلامی کو وفاداری کہہ سکیں وہ ان دونوں کو ویپائروں کو.....“
 ”دونوں ویپائروں کو!“

”ہاں۔ کیونکہ تابوت دو ہیں۔ چنانچہ ایک ڈریکولا کا اور دوسرا۔“

”دوسرا؟“ چارلس نے پوچھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ دوسرا ویپائر کون ہے۔

”آپ کی بھالی۔ چنانچہ دن کی روشنی میں جب یہ دونوں ویپائر اپنے اپنے تابوت
 میں سو رہی تھے، کلیو ان تابوتوں کو پھکڑے میں رکھ کر یہاں لے آیا کہ جب رات کا
 اندھیرا اتر آئے تو یہ دونوں عفریت اپنے اپنے تابوت میں سے نکل کر اپنا اپنا شکار
 حاصل کر لیں۔ لیکن اب.....“ اس نے تابوتوں کی طرف اشارہ کیا۔
 ”اب کیا؟“ چارلس نے سانس روک کر پوچھا۔

”اب یہ کہ چونکہ ہم نے دونوں تابوتوں میں ایک ایک صلیب رکھ دی ہے اس
 لئے رات کے ختم ہونے کے وقت ویپائر ان تابوتوں میں داخل نہ ہو سکیں گے۔ اب
 اگر ہم انہیں پکڑ نہ سکے اور فرار ہوتے رہے۔ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ رات ختم ہو جائے گی
 اور دونوں ویپائر سورج کے رحم و کرم پر ہوں گے اور جب سورج کی شعاعیں براہ
 راست ویپائر پر پڑتی ہیں تو فنا ہو جاتا ہے۔“

”مطلب یہ کہ ہمیں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہئے۔“ چارلس نے کہا

”ہاں۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔“ فادر شینڈور نے کہا، کاش کہ میں نے تمہارا یہ
 مشورہ مان لیا ہوتا کہ ہمیں فوراً قصر کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے۔ جب برائی کا پودا
 پھوٹ نکلے تو اسی وقت اسے اکھاڑ پھینکنا چاہئے کہ وہ بڑھ کر تناور درخت نہ بن
 جائے۔ اور جب شیطان آزاد ہو چکا ہو تو بلاناخیر اس کی بیخ کنی کر دینی چاہئے۔“

باب-9

فادر شینڈور چارلس کو ڈانٹا کے کمرے سے باہر لے آیا۔ اور باہر آتے ہی سیدھا
 خانقاہ کے صدر دروازہ کی طرف چلا اور چارلس اس کے ساتھ تھا فادر شینڈور جلدی
 میں ضرور تھا لیکن وہ جو کچھ کر رہا تھا وہ بے سوچے سمجھے نہ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ
 معلوم ہو رہا ہے، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہاں اسے کیا ملے گا۔

دروازہ کھول کر اس نے باہر دیکھا درختوں کے ایک جھنڈ میں پھکڑا کھڑا تھا۔ فادر
 شینڈور کو جب یقین ہو گیا کہ پھکڑے کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ اس نے دروازہ کھول
 کر باہر آگیا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا پھکڑے کے قریب پہنچا اور بے دھڑک اس پر جا چڑھا
 اور اپنے مضبوط ہاتھ سے چارلس کا ہاتھ پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں اسے بھی اوپر گھسیٹ
 لیا۔

پھکڑے میں دو لمبے بکس رکھے ہوئے تھے۔ بکس یا..... تابوت فادر شینڈور نے
 ایک تابوت کا ڈھکن اٹھایا، تابوت خالی تھا البتہ اس میں باریک مٹی کی چکنی سی تہہ
 بچھی ہوئی تھی جیسے کسی کا بستر لگا ہوا ہو۔

”ہم“ وہ بڑبڑایا۔ ”مجھے پہلے ہی سے سوچ لینا چاہئے تھا۔“

”کیا سوچ لینا چاہئے تھا؟“ چارلس نے پوچھا۔ وہ حواس باختہ ہو رہا تھا۔

”یہی کہ وہ اسی طرح یہاں آئے گا اور ضرور آئے گا۔“ فادر شینڈور نے کہا۔

اور اپنے چننے کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر دو صلیبیں برآمد کیں ایک صلیب اس
 نے اس تابوت میں جس کا ڈھکن اس نے اٹھایا تھا، مٹی پر رکھ دی۔ اور سر سے
 چارلس کو اشارہ کیا، کہ وہ دوسرے تابوت کا ڈھکن کھول دے، چارلس نے ڈھکن
 کھولا۔ خانقاہ کی کھڑکی سے آتی ہوئی اندھی روشنی میں اس نے دیکھا کہ باریک مٹی کا

عین اسی وقت خانقاہ کے صحن میں سے دبا دبا شور سنائی دیا۔ فادر شینڈور مرغ بادنما کی طرح خانقاہ کی طرف گھوم گیا۔ اس کے بثرے سے تردد کے آثار ہوید اٹھے۔ یہ شور خانقاہ کے مقدس سکون اور اس کی مقدس روایتوں سے کسی طرح میل نہ کھاتا تھا۔ یہ واقعی ایک عجیب اور حیرت انگیز بات تھی کہ خانقاہ میں آج شور بلند تھا حالانکہ اس کی پوری تاریخ میں پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔

چارلس اور فادر شینڈور چھکڑے پر سے نیچے کود آئے اور خانقاہ کے دیوارے کی رف بھاگے۔ جب وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو صحن میں موجود ایک راہب نے اطمینان کا سانس لیا اور وہ فادر شینڈور کی طرف بڑھا۔

”کیا بات ہے برادر پیٹر؟ یہ گڑبڑ کا ہے کی ہے؟“ فادر شینڈور نے پوچھا۔

”عورت کو ہم نے پکڑ لیا ہے فادر.....“

”شکر ہے۔ کہاں سے؟“ ”وہ اصطبل میں چھپی ہوئی تھی۔“

”اور ڈرا کیوں؟“

راہب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

فادر شینڈور چند ثانویوں تک کچھ سوچتا رہا اور پھر بولا۔

”اچھا اے..... اے.... لڈوگ کے حجرے میں لے جاؤ۔“

برادر پیٹر پلٹ کر بھاگ پڑا۔ فادر شینڈور نے چارلس کا ہاتھ پکڑا اور اسے خانقاہ
طرف لے چلا۔

”اگر آپ کوٹ ڈرا کیولا کی بنائی ہوئی خوف ناک چیز کو فنا ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں میرے ساتھ آئیے۔“

فادر شینڈور نے کہا۔ ”لیکن یہ سن لیجئے کہ وہ منظر کمزور دل والوں کے دیکھنے کی نہیں ہے۔“

چارلس نے کوئی جواب نہ دیا البتہ شینڈور کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ دونوں مختلف گزرگاہوں کو عبور کر کے اس حجرے میں پہنچ گئے جس میں لڈوگ کام کیا کرتا تھا۔ لڈوگ وہاں موجود تھا۔ لیکن اب اس میں ایک عجیب تبدیلی ہو چکی تھی۔ یہ وہ لڈوگ نہ تھا جو اپنی دست کاری پر فخر کرنے کا عادی تھا۔ بلکہ یہ سما ہوا لڈوگ تھا جو خوف سے ایک کونے میں جھکا ہوا تھا۔ جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ یہاں کوئی بھیانک واقعہ ہونے والا ہے۔ وہ سما ہوا تھا اس کے باوجود چارلس نے سوچا خدا جانے کیوں وہ اپنی ذات سے مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ چارلس لڈوگ کی اس تبدیلی کو سمجھ تو نہ سکا البتہ اس نے یہ ضرور سمجھ لیا کہ یہ شخص اب پاگل نہ رہا تھا بلکہ کسی معجزے کی وجہ سے وہ پوری طرح اپنے حواس میں آچکا تھا۔ بظاہر وہ خوف زدہ تھا لیکن بہ باطن بشار اور مطمئن۔

چارلس فادر سینڈور کی طرف گھوم گیا کہ اسے لڈوگ کی اس ناقابل فہم تبدیلی کی طرف متوجہ کر دے لیکن موخر الذکر کسی طرف بھی متوجہ ہونے کے بجائے احکامات صادر کرنے میں مصروف تھا۔

”برادر پنیر! لڈوگ کو باہر لے جاؤ“ اس نے آہستہ سے کہا اور پھر پکار کر کہا
 ”اس عورت کو اندر لے آؤ۔“

لڈوگ لائے سیدھے قدم پھیلتا دروازے کی طرف چلا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ایک سیکنڈ کے لئے رک گیا اور گردن گھما کر اپنے حجرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تو چارلس چونکا اور بے چین ہو گیا۔ لڈوگ کی اس نظر میں عجیب اسباط اور عیاری تھی۔ جیسے وہ ہمیشہ کے لئے اس حجرے سے رخصت ہو رہا ہو جیسے وہ اس بات کو جانتا ہو جس سے کوئی اور واقف نہ تھا۔

وہ کمرے سے نکل گیا تو دو راہب حجرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک

”مسٹر چارلس! اس بلا کو دیکھئے اور یاد رکھئے کہ یہ وہ عورت نہیں ہے جس سے آپ واقف تھے۔ یہ وہ نہیں ہے جو آپ کی بھابی تھی۔ آپ کے بھائی کی بیوی مرچکی۔ یہ جو آپ کے سامنے ہے یہ ایک خول ہے اور اس خول میں جو ہے وہ ایک خبیث روح ہے جس کی غذا انسانوں کا خون ہے چنانچہ ہم جس چیز کو فنا کریں گے وہ یہ خبیث روح ہوگی جو اس خول میں ڈرا کیولا کی مہربانی سے ساگئی ہے۔“

چارلس خاموش رہا۔ وہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔
”لے آؤ اسے“ فادر شینڈور نے کہا۔

اور دونوں راہب جو اسے پکڑے ہوئے تھے۔ ہیملن کو گھسیٹ کر کراس میز کی طرف لانے لگے جس کے سامنے بیٹھ کر لڈوگ بڑی تندہی اور توجہ سے دست کاری کے نمونے بنایا کرتا تھا۔ فادر شینڈور نے وہ دو چار برش اور کانڈ کے ٹکڑے میز پر سے ہٹا دیئے جو اب بھی اس پر پڑے ہوئے تھے۔

ہیملن دیوانوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ بھیڑیے کی طرح غراری تھی اور کتے کی طرح رو رہی تھی۔ اس کا پورا جسم کبھی تن جاتا تھا اور کبھی ڈھیلا پڑ جاتا تھا۔ وہ نافق الفطرت قوت سے لاتین چلا رہی تھی، تڑپ رہی تھی اور مروٹیاں لے رہی تھی لیکن دونوں راہبوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

راہب اسے گھسیٹ کر میز کے قریب لے آئے اور بڑی کوششوں کے بعد اس پر چت لٹا دیا اور اسے دبوچے رہے۔ اب ایک تیسرا راہب حجرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نوکدار چوبی کھونٹ تھا جو ایک فٹ لمبا تھا۔ کھونٹ کی لکڑی حجرے کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اور اس تازہ لکڑی کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ یہ کھونٹا ابھی تیار کیا گیا تھا۔ راہب نے یہ کھونٹا فادر شینڈور کو دے دیا اور پھر اپنے ڈھیلے ڈھالے چنے میں ہاتھ ڈال کر ایک وزنی موگری برآمد کی۔

عورت کو اپنے درمیان پکڑ رکھا تھا جو کسی وحشی جانور کی طرح اپنی کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔

چارلس لڈوگ کو بھول گیا۔ وہ ہر چیز اور ہر بات کو بھول گیا۔ وہ صرف ہیملن کو دیکھ رہا تھا اور صرف اس کی آواز سن رہا تھا۔ ہیملن کے شیطانی وجود سے حجرے کی فضا متعفن ہو گئی۔ اس کا دوزخی سانس فضا کی رگ رگ میں سا گیا۔ اور چارلس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس حجرے کا مقدس ماحول یلکھت بدل گیا ہو۔ اس کی طبیعت گھبرانے لگی اور اسی کا جی چاہا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے۔

چارلس ہیملن کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس نفرت انگیز اور گھٹاؤنی صورت میں عورت کے خد و خال تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو تند خشک مزاج اور چڑچڑی ہونے کے باوجود اس کی مخلص اور محبت کرنے والی بھابی تھی۔ لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ یہ عورت اس کی بھابی نہ ہو سکتی تھی اس کے ہونٹ کھینچے ہوئے تھے، اس کے خونخوار دانت چمک رہے تھے اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔

فادر شینڈور اس کی طرف بڑھا تو وہ جنمی بھوت کی طرح اپنے آپ کو چھڑانے اور فادر شینڈور پر حملہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ چارلس بھی آگے بڑھ کر فادر شینڈور کے قریب جا کھڑا ہوا کہ جب ضرورت ہو تو وہ اس کی مدد کرے چارلس کو دیکھتے ہی وہ غرائی اور پھر اس نے ایک ققمہ لگایا۔ اس کا یہ ققمہ چیخ سے مشابہ تھا اور اتنا بھیانک تھا کہ چارلس کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈک کی لہر دوڑ گئی۔

اگر وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو کاٹنے میں کامیاب ہو گئی تو پھر وہ اس کا ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اسی کا یا ڈرا کیولا کا۔ چارلس نے اس کے خونخوار اور زہریلے دانتوں پر سے اپنی نظریں ہٹانے کی کوشش کی لیکن ہٹانہ نہ سکا۔

فادر شینڈور نے گردن گھما کر چارلس کی طرف دیکھ کر بغیر کہا۔

پھر ساکت ہو گیا۔

چارلس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”مسٹر چارلس!“ فادر شینڈور نے بڑی نرم آواز میں کہا۔ ”یہ مرحلہ طے ہو گیا۔“

اس نے چند قدم پیچھے ہٹ کر چارلس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے میز کے قریب لے آیا۔ چارلس دیکھنا نہ چاہتا تھا لیکن خود بخود اس کا نگاہیں میز پر جھک گئیں۔

اور اس نے دیکھا کہ اب میز پر وہ ڈائین نہیں بلکہ اس کی بھابھی ہیلن لیٹی ہوئی تھی۔ وہی نقوش اور وہی خد و خال۔ اس کے بشرے سے اب وہ گھٹاؤ تاپن عیاں نہ تھا۔ اب یہ کسی دوزخی بلا کا نہیں بلکہ اس کی بھائی کی اصل بیوی کا چہرہ تھا۔ اب اس پر کرخنگی کے بجائے ملاحظت تھی اور خون کی پیاس کے بجائے ملکوتی سکون تھا۔ ہیلن پرسکون اور ابدی نیند سو رہی تھی۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

فادر شینڈور میز کی طرف گھوم گیا۔

ہیلن جسے میز پر چپ لٹایا گیا تھا۔ ایک راہب نے اسے شانوں کے قریب سے اور دوسرے نے اس کی ٹانگیں ایسی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھیں کہ وہ اپنے سر کے علاوہ کوئی اور عضو ہلا نہ سکتی تھی۔ اور وہ اپنا سر بیچ رہی تھی اسے دائیں بائیں تیزی سے ہلا رہی تھی۔ وہ تھوک رہی تھی، چیخ رہی تھی اور غراری رہی تھی۔ یہاں تک کہ حجرہ اس کی ان غیر ارضی آوازوں سے گونجنے لگا۔

فادر شینڈور ہیلن کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے لمحے بھر کے لئے اپنی نگاہیں حجرے کی چھت کی طرف اٹھادیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کوئی دعا پڑھ رہا تھا۔

اور پھر اس نے وہ چوبی کھوٹا ہیلن کی بائیں چھاتی پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے موگری بلند کی۔

چارلس نے اپنے معدے میں شدید اینٹھن محسوس کی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام کر دوہرا ہو جائے اور تے کر دے کہ یہ تکلیف کم ہو۔ اسے یہاں نہ آنا چاہئے تھا۔ وہ یہ کارروائی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کوئی انسان نہ دیکھ سکتا تھا۔

لیکن وہ ہیلن اور فادر شینڈور پر سے اپنی نظریں ہٹا نہ سکا۔

دفعۃً فادر شینڈور کا موگری والا ہاتھ بجلی کی تیزی سے نیچے چلا۔ اور ایک خون منجمد کر دینے والی چیخ سے حجرے کی سنگین دیواریں کانپ گئیں۔ یہ ہیلن کی اور کسی بھی انسان کی چیخ نہ تھی۔ یہ عذاب میں پھنسی ہوئی ایک روح کی آخری چیخ تھی۔ موگری کی ایک ہی ضرب میں چوبی کھوٹا نصف سی زیادہ ہیلن کے سینے میں اتر چکا تھا۔ اس کا ’کھونٹے کا‘ اوپری حصہ جو اس کے سینے سے باہر تھا لمحہ بھر تک تھر تھراتا رہا اور

اس وقت فادر شینڈور کے ہاتھ میں تھا۔

”لڈوگ!“ فادر شینڈور بڑبڑایا، ”ہم نے اس کے لئے کیا کچھ نہیں کیا اس کے باوجود اب وہ فرار ہونا چاہتا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟“

وہ کھڑکی کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے رات کے اندھیرے کے اسرار معلوم کرنا چاہتا ہو۔

”کیس ایسا تو نہیں کہ..... اس کا وہ دوزخی آقا ڈرا کیوالا اسے بلا رہا ہو؟ لڈوگ..... اس کے پاس تو بچنے کی کوشش نہیں کر رہا؟“

اور دفعتاً فادر شینڈور تن کر کھڑا ہو گیا۔ ایک بار پھر وہ عملی قدم اٹھانے کے لئے تیار تھا۔

”آئیے مسٹر چارلس۔ اگر لڈوگ کے دل میں یہ آرزو اور یہ طلب بیدار ہو چکی ہے تو ہم اسے آزاد نہیں چھوڑ سکتے۔“

اور وہ گزرگاہ میں چل پڑا۔ فادر شینڈور ایسے لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا اور اتنا تیز چل رہا تھا کہ اس کا ساتھ دینے کے لئے چارلس کو تقریباً بھاگنا پڑا رہا تھا۔ گزرگاہ کے ایک اندھیرے کونے میں وہ دونوں کسی چیز سے ٹکرا گئے۔ جو فرش پر پڑی ہوئی تھی دونوں گرتے گرتے بچے تو وہ چیز کراہنے لگی۔ یہ برادر مارک تھا جو بے سدھ اور گٹھری بنا پڑا تھا۔ فادر شینڈور جلدی سے اس پر جھک گیا اور برادر مارک کا سر ٹٹولنے لگا۔ اس کے سر پر کسی ٹھوس وزنی چیز سے ضرب لگائی گئی تھی۔

”لڈوگ!“ فادر شینڈور بڑبڑایا، ”کہاں..... ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔“

یہ ڈانٹا کی چیخ تھی اور چارلس نے اس کی آواز پہچانی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرف بنی ہوئی کے حجرے کی طرف بھاگا۔ فادر شینڈور بھی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر برادر ارگو اس کے حال پر چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگ پڑا۔

حجرے میں موجود راہب رب العزت کی حمد گانے لگے اور چارلس اور فادر شینڈور سر جھکائے کھڑے رہے۔ اور خاموشی سے ہیملن کی مغفرت کی دعا مانگتے رہے۔

”آئیے مسٹر چارلس“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”اس وقت آپ کو شراب کی ضرورت ہے۔“

اور جب وہ دروازے کی طرف چلے تو اس سے چند قدم ادھر فادر شینڈور نے کسی آہنی چیز سے ٹھوکر کھائی اور وہ چیز ایک چھٹا کے کی آواز کے ساتھ فرش پر چند انچ تک لڑھکتی چلی گئی۔ فادر شینڈور نے جھک کر وہ چیز اٹھالی۔ یہ ایک آہنی سلاخ تھی۔ فادر شینڈور نمایاں طور پر چونکا۔ چارلس حیران تھا کہ اس میں چونکنے کی کیا بات تھی! فادر شینڈور حجرے کی کھڑکی کی طرف گھوم گیا۔ کھڑکی میں چار سلاخیں ہوا کرتی تھیں۔ دو سلاخیں بڑی مہارت سے کاٹ دی گئی تھیں۔ اور ان کئی ہوئی سلاخوں کا ایک ٹکڑا

بڑھے اور بڑی خطرناک تیزی سے چھکڑے کو غیر ہموار راستے پر سے کھینچنے سڑک کی طرف چلے۔

”گھوڑے۔“ چارلس چیخا۔ ”گھوڑے لاؤ۔ جلدی۔“
 ”نکرنہ کرو۔ ہم ان کا تعاقب کریں گے۔“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”لیکن غلت اور بدحواسی میں نہیں۔“

اور وہ واپس خانقاہ کی طرف چلا۔ لڈوگ زمین پر پڑا۔ لوٹ رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ فادر شینڈور نے شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن پھر فوراً ہی اس کا غصہ رحم اور ہمدردی میں تبدیل ہو گیا۔ لڈوگ غریب کا کیا قصور تھا؟ ڈرائیولا مافوق الفطرت قوتوں کا مالک تھا اور بے گناہ انسانوں پر اثر ڈال کر انہیں اپنا غلام بنا لیتا تھا وہ تو شکر ہے کہ ڈرائیولا ابھی ابھی زندہ ہوا تھا۔ صرف ہیلن کا خون پی سکا تھا۔ چنانچہ اس کی تمام قوتیں عود کر آئیں تو وہ یوں بزدلوں کی طرح فرار ہونے کے بجائے اپنے ہاتھ کے ایک اشارے سے بھیڑیوں کی پوری فوج بلا لیتا۔ اور یہ بھیڑیے چارلس اور فادر شینڈور کی بوئیاں اڑا دیتے لیکن کونٹ ڈرائیولا زندہ ہوتے ہوئے بھی مکمل نہ تھا۔ البتہ اگر وہ زندہ رہ گیا تو بہت جلد اپنی تمام شیطانی قوتیں حاصل کر لے گا اور اس کے بعد اسے فدا کرنا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہوگا۔

خانقاہ کے دروازہ پر برادر مارک تین چار دوسرے راہبوں کے ساتھ فخر کھڑا تھا۔

”برادر مارک۔“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”لڈوگ کو اس کے حجرے میں لے جاؤ۔ اس کے ساتھ سختی نہ کرنا، لیکن ہوشیار رہنا، کیونکہ اب اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“

چارلس بہت زیادہ بے چین تھا۔ اس کے دل میں ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ اسے

دروازہ بند تھا۔ دونوں نے کواٹروں پر اپنے کندھے دے کر زور مارا تو وہ کھل گئے اور چارلس اور فادر شینڈور اپنے زور میں بیک وقت حجرے میں در آئے۔ اور انہوں نے دیکھا کہ ڈرائیولا ڈانٹا کو اپنی ہانہوں میں گھسیٹ کر کھڑی کی طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ شیشہ توڑ کر وہ دوسری طرف نکل گیا۔
 چھکڑا۔ فادر شینڈور نے کہا۔

وہ دونوں حجرے سے نکل کر گزرگاہ میں بھاگ پڑے۔ اور کچھ ہی دیر بعد وہ خانقاہ کے صدر دروازے سے باہر اندھیری رات میں تھے۔ چھکڑا اپنی جگہ پر موجود تھا۔ لیکن اس میں دو گھوڑے جوت دیئے گئے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک انسانی سایہ بھی کوچوان کی نشست پر مستعد اور تیار بیٹھا ہوا تھا۔

ایک اندھیرے میں سے ڈرائیولا نکل آیا۔ وہ بے ہوش ڈانٹا کو اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے ڈانٹا کو تابوتوں کے بیچ میں ڈال دیا۔ اور خود اچک کر کوچوان کے قریب بیٹھ گیا۔ چابک کا سزا کارات کی تاریکی میں گونج گیا۔ اور گھوڑے خاموشی سے چھکڑے کو کھینچنے لگے۔ کوچبان ذرا آگے کی طرف جھکا، تو اس کے سر پر سے کپڑے کی بڑی ٹوپی جس نے اس کے نصف چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ کھسک گئی یہ کوچبان کوئی اور نہیں بلکہ کلیو تھا۔

دفعاً ”کہیں سے ایک انسانی سایہ نکل کر چھکڑے کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔“

”آتا! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔“

یہ آواز لڈوگ کی تھی اور یہ وہی تھا۔ جو چھکڑے کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

فادر شینڈور نے پھانک کھلایا اور چھکڑے کی طرف بھاگا۔ چارلس اس کے پیچھے تھا، ڈرائیولا نے ان دونوں کو آتے دیکھا، تو وہ غصے سے بھیڑیے کی طرح نہایت زور سے چیخا۔ اور لڈوگ کو بڑی بیدردی سے ایک طرف ڈھکیل دیا۔ گھوڑے پھر آگے

”ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں؟“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”نہیں بھی۔ جب ہم آپ کو یہاں لائے تھے۔ تو اس وقت آپ وقت اور فاصلے کا اندازہ لگانے کے قابل ہی نہ تھے۔“

”آپ کتنا کیا چاہتے ہیں؟“

”صرف یہ کہ یہاں سے قصر تک پورے ایک دن کی مسافت ہے۔ وہ بھی تیز رفتار گھوڑے پر۔“

”تب تو اور بھی برا ہوا۔“

”نہیں بلکہ اس میں الٹا ہمارا ہی فائدہ ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”کچھ ہی دیر بعد رات ختم ہو جائے گی۔ اور دن کا اجالا پھیلتے ہی ڈرائیولا اپنی تابوت میں جاسوئے گا۔“

”لیکن ہم نے تابوت میں صلیب رکھ دی ہے اور آپ نے کہا تھا کہ اب ڈرائیولا اس میں گھس نہ سکے گا۔“

”ہم نے صلیب رکھ دی تھی تو کلیو اسے نکال کر پھینک دے گا۔ اپنے آقا کا بستر تیار کریگا۔ اور جب اس کا آقا تابوت میں لیٹ جائے گا تو پھر کلیو آپ کی بیوی کی نگرانی کرے گا۔ چنانچہ آپ کی بیوی دن پھر محفوظ رہیں گی یہ لیجئے۔“

اور فادر شینڈور نے بندوق میں کارتوس بھر کر چارلس کے ہاتھ میں تھمادی اور خود اپنی میز کی درازیں کھول کر ان میں کسی چیز کو تلاش کرنے لگا۔

”مناسب ہو گا کہ اسے آپ ہی رکھیں۔“ چارلس نے کہا ”یہ آپ کی بندوق ہے اور اس کا آپ استعمال جانتے ہیں۔“

”ہاں لیکن میں نے صرف جانوروں کا شکار کیا ہے، میں انسانوں کو گولی مارنے کا

نہ لڈوگ کی فکر تھی اور نہ برادر مارک کی پرواہ۔ وہ تو جلد از جلد گھوڑے پر سوار ہو کر ڈرائیولا کے تعاقب میں جانا چاہتا تھا۔ ہاں سراسر عفریت کے تعاقب میں جو ڈائنا کو لے اڑا تھا اور وہ اس خیال سے کانپ گیا۔ کہ اگر وہ ڈرائیولا کو فنا نہ کر سکے یا ڈائنا کو اس کے پنجے سے نہ چھڑا سکے تو اس کی چارلس کی بیوی بھی جیلن کی طرح ڈائن بن جائے گی۔ چنانچہ ایک ایک لمحہ جو گذر رہا تھا، ڈائنا کو زندہ مردوں کے جہنم کے قریب لے جا رہا تھا۔

لیکن فادر شینڈور پر سکون تھا، چنانچہ اس نے چارلس کو اپنے ساتھ اپنی مطالعہ گاہ میں چلنے کو کہا، موخر الذکر انکار نہ کر سکا، چنانچہ فادر شینڈور کے پیچھے چل دیا۔ وہاں پہنچ کر فادر شینڈور نے کتابوں کی ایک الناری کے پیچھے ہاتھ ڈال کر بندوق باہر نکال لی۔ خانقاہ میں بندوق؟ اپنی بے تابی کے باوجود چارلس اس بات پر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ واقعی عجیب بات تھی۔ کبھی کسی خانقاہ میں بندوق نہ رہی ہوگی۔ راہب تو لازمی جھگڑے اور خون خرابے کے قریب تک نہیں پھٹکتے۔

”ڈرائیولا، آپ کی بیوی کو لے کر سیدھا قصر کی طرف جائے گا۔“ فادر شینڈور نے اس طرح کہا۔ جیسے وہ حالات حاضرہ پر محض وقت گزاری کے لئے تہمرہ کر رہا ہو۔ ”قصر میں پہنچتے ہی وہ محفوظ ہوگا اور پھر آپ کی بیوی کو ہم کسی صورت نہ بچاسکیں گے۔“

”تو پھر ہمیں.....“

”ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ ڈرائیولا کو قصر تک نہ پہنچنے دیں بلکہ اسے راستہ ہی میں روک لیں۔“

”تو پھر خدا کے لئے فوراً چلیئے فادر۔“ چارلس نے کہا ”آپ یہاں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور ایک دو گھنٹے میں وہ.....“

عادی نہیں ہوں۔“

”لیکن ڈراکیولا انسان تو نہیں ہے؟“

”بے شک۔ اسی لئے اس پر گولی اثر نہیں کر سکتی۔“

”پھر یہ بددق۔۔۔“ چارلس کا دماغ مارے پریشانی کے بالکل ٹھس ہو گیا تھا۔

”کلیو کے لئے ہے۔ وہ ویپائر نہیں انسان ہے اور شاید آپ کو اس پر گولی چلانے کی ضرورت پڑ جائے۔ مسٹر چارلس! بوقت ضرورت میں اپنی خانقاہ کے اصولوں میں ردو بدل کر سکتا ہوں۔ لیکن وہ بھی ایک حد تک چنانچہ کلیو پر میں گولی چلا نہ سکوں گا۔ ہمیں۔۔۔ چند نئے نوکدار کھونٹوں کی ضرورت پڑے گی۔ آئیے آپ اور برادر مارک گھوٹوں پر زین کس دیں تب تک میں ڈراکیولا کو فنا کرنے کے انتظامات مکمل کر لوں۔“

رات کے آخری گھنٹے ختم ہو رہے تھے اندھیرا سٹ کر افق مغرب میں ڈوبنے لگا تھا اور افق مشرق سے روشنی کے سوتے پھوٹ رہے تھے چارلس اور فادر شینڈور اپنے اپنے گھوڑے پر سوار اب تک اندھیرے میں اور اندازاً راستے طے کرتے رہے تھے لیکن اب وہ اپنے سامنے کچی سڑک پر چھکڑے کے پیوں کے نشانات دیکھ سکتے تھے۔ کچی سڑک پر پیوں کے ہلکے نشانات اور ان کے کناروں پر مردہ مٹی کی مٹھی برابر ڈھیریں اس بات کا پتہ دیتی تھیں کہ کلیو چھکڑے کو صحیح معنوں میں اڑا لے گیا تھا ڈراکیولا اپنے تابوت میں لیٹ چکا ہوگا۔ لیکن اس کے خادم نے چھکڑے کی رفتار کم نہ کی تھی اور ڈانٹا۔۔۔؟

چارلس اپنے گھوڑے کو بے تحاشہ ایڑی مارنے لگا۔ ڈانٹا کی اس وقت کی حالت کے تصور نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ خدا جانے وہ اب تک بے ہوش ہوگی یا ہوش میں آچکی ہوگی اور اگر اسے ہوش آگیا ہوگا۔ تو مارے خوف کے اس کی حالت وحشیوں کی

سی ہوگئی ہوگی۔۔۔۔۔ وہ ہوش میں تھی یا بے ہوش یہ تو چارلس نہ جانتا تھا۔ البتہ یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ ڈراکیولا کے قبضے میں تھی اور رات کا اندھیرا اترتے ہی وہ ہمیشہ کے لئے اس کی بن جائیگی ہیلن کی طرح کونٹ ڈراکیولا کی دلمن بن جائے گی۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔

فادر شینڈور اصرار کر رہا تھا کہ گھوڑوں کو ذرا سستا لینے دیا جائے۔ لیکن چارلس اس قدر بیتاب تھا کہ گھوڑے کو دم نہ لینے دینا چاہتا تھا انہیں مار مار کر اس وقت تک بھگاتا رہے جب تک وہ بے دم ہو کر گر نہیں جاتے۔

دوپہر ڈھل گئی۔۔۔۔۔ دور کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سہ پہر کی روشنی نرم پڑ گئی اور رفتہ رفتہ دن ختم ہونے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ چوراہے پر پہنچ جائیں گے۔۔۔۔۔ ہاں وہ چوراہا دور نہ تھا۔ جہاں سے ایک راستہ قصر ڈراکیولا تک جاتا تھا لیکن اب تک انہیں چھکڑا نظر نہ آیا تھا۔ یقین نہ آتا تھا کہ کلیو نے چھکڑے کی رفتار خطرناک حد تک تیز کر رکھی ہوگی۔ لیکن واقعات ہو چکے تھے وہ ناقابل یقین ہونے کے باوجود حقیقت تھے۔

فادر شینڈور نے اپنے گھوڑے کی لگائیں کھینچ لیں اور دندانے وار اور ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔

”ہمیں چھوٹا اور مختصر راستہ اختیار کرنا چاہئے۔“ فادر شینڈور نے کہا کہ ”ہم ڈراکیولا کے عین سامنے اس چھکڑے کو روک لیں۔ آئیے۔“

اور انہوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں وحشت ناک ڈھلانوں کی طرف موڑ دیں۔ ڈھلان جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ان کے گھوڑوں کی رفتار تیز نہ تھی، ایک طرف گھنے جنگل کے کنارے کنارے اوپر چڑھ رہے تھے۔ جھاڑیاں ختم ہوئیں اور اب ڈھلان سنگلاخ تھی۔ یہاں وہاں چھوٹے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے اور ان کے

فوراً ہی وہ دونوں سڑک پر نکل آئے اور آگے بڑھتے ہوئے چھکڑے کے راستے میں کھڑے ہو گئے چارلس نے بندوق اٹھائی اور کوچیان کی نشست پر بیٹھے ہوئے کلیو کو اس کی زد میں لے لیا۔

کلیو لمحے بھر کے لئے دم بخود رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف یوں دیکھتا رہا، جیسے وہاں ان دونوں کی موجودگی کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو، دفعتاً اس کے چہرے کے پٹھے ڈھیلے پڑ گئے اس کا منہ کھل گیا اور اس نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں۔

بندوق کی نالی عین اس کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی

فادر شینڈور نے کہا ”بس۔ بہت دور آگے اتر آؤ چھکڑے پر سے۔“

ایک لمحہ تک کلیو بے حرکت بیٹھا رہا، جیسے وہ اس بات پر غور کر رہا ہو کہ فادر شینڈور کے اس حکم کی تعمیل کرنا کہاں تک مناسب ہوگا۔ پھر وہ ایک طرف کھسک کر نشست کے کنارے پر آگیا اور اس کا دایاں ہاتھ لگام چھوڑ کر پہلو کی طرف لٹک گیا۔ یکایک تاریک ہوتی ہوئی فضا میں بجلی سی کوند گئی، کلیو کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو تھا اور اس نے اپنا چاقو والا ہاتھ بلند کیا۔ وہ چاقو فادر شینڈور کی طرف پھینک کر مارنے کی تیاری کر رہا تھا، لیکن اس کے دل کی دل ہی میں رہی۔ ابھی اس کا ہاتھ جھکا بھی نہ تھا کہ چارلس نے بلبلی دبا دی۔

گولی شاید اس کے سینے میں لگی تھی، کیونکہ گولی کے دھکے کو برداشت نہ کر کے وہ دہرا ہو کر انچ بھرا اچھلا، گرا، نشست پر گھڑی بھر اچھلتا رہا۔ اور پھسل کر ڈھرام سے سڑک پر آ رہا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا تھا۔ کلیو نے پھر حرکت کی۔ فادر شینڈور چھکڑے کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کے قریب پہنچتا، گھوڑے خوف سے ہنسا کر پیچھے ہٹے اور پھر ایک دم سے بھاگ پڑے اگر چارلس

گھوڑے ٹھوکریں کھاتے اوپر چڑھ رہے تھے۔

اندھیرا ان سے زیادہ تیز ثابت ہوا۔ اور وہ ڈھلان کی چوٹی پر سے تیز دھارے کی طرح بہہ آیا تھا، جیسے وہ ان دونوں کو روک دے گا لیکن وہ آگے بڑھتے رہے اور چڑھتے رہے۔

چارلس پوری طرح ناامید ہو چکا تھا، اس کے باوجود وہ گھوڑے کو آگے بڑھا رہا تھا۔ محض اس لئے کہ یہاں سے لوٹ جانا بھی اتنا ہی بے معنی تھا جتنا کہ اب سے یہ تعاقب نظر آ رہا تھا۔ وہ مایوس ہو چکا تھا، کہ یکایک بائیں طرف قصر ڈرا کیولا کی سیاہ دیواریں یوں نمودار ہو گئیں۔ جیسے پورا قصر کسی جادو کے زور سے زمین میں سے نکل آیا ہو۔ عین سامنے راستہ تھا۔ اور کچے راستے پر چھکڑے کے پیوں کے تازہ نشانات نظر نہ آ رہے تھے۔

ڈرا کیولا کا چھکڑا اب تک تو اس طرف سے نہ گزرا تھا۔

فادر شینڈور اپنے گھوڑے پر سے اتر آیا، اور اسے ایک درخت سے باندھ دیا، چارلس نے اس کی تقلید کی وہ دونوں اپنا دم درست کر رہے تھے کہ چھکڑے کے پیوں کی کھڑکڑاہٹ کی آواز سنائی دی چارلس اور فادر شینڈور درختوں کے جھنڈ میں سے نکل کر سڑک کے اس موڑ کی طرف بڑھے جس کے دوسری طرف سے یہ آواز آ رہی تھی۔

آواز سے معلوم ہو رہا تھا۔ کہ چھکڑا، آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ گھوڑے شاید مسلسل سفر کرنے کی وجہ سے تھک گئے تھے موڑ پر چھکڑا نمودار ہو گیا۔ کلیو کوچیان کی نشست پر اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ چھکڑے کا ایک پیہ پتھروں میں اتر گیا۔ تو کلیو کے پیچھے چھکڑے میں رکھے ہوئے دو تابوت اکدم سے اچھل کر آپس میں ٹکرائے۔

فادر شینڈور نے گردن گھما کر چارلس کی طرف دیکھا اور اپنی ہنھونیں اچکائیں

تابوت پل کے کنارے پر سے بھی پھسل کر خندق میں جا پڑا خندق کا پانی بخ بن چکا تھا۔ چنانچہ تابوت اس پر پھسلتا ہوا قصر کی کائی آلود دیوار تک چلا گیا۔ ایک اور تابوت اب بھی چھکڑے میں رکھا ہوا تھا۔ چارلس اپنے گھوڑے سے اتر کر جھکے ہوئے چھکڑے پر جا چڑھا فادر شینڈور اس کے پیچھے تھا۔ دونوں نے مل کر تابوت کا ڈھکن اٹھایا تو اس وقت ان دونوں کے بوجھ سے چھکڑا اور بھی زیادہ جھک چکا تھا۔



اچھل کر ایک طرف نہ ہٹ گیا ہوتا تو گھوڑے اور چھکڑا اسے کھلتا ہوا گزر جاتا۔ گھوڑے بڑی برق رفتاری سے آخری ڈھلان چڑھ رہے تھے اور ان کے منہ اور پھڑکتے ہوئے نھتوں سے کف جاری تھا۔ جیسے کوئی ان دیکھا ہاتھ ان پر آتشی کوڑے برسارہا تھا۔ اور وہ بے تحاشہ اپنی دوزخی پناہ گاہ کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ قصر ڈرا کیولا جو صرف تین فرلانگ میل دور تھا۔

چارلس اور فادر شینڈور نے اپنے گھوڑے کھولنے اور ان پر سوار ہوئے اور انہیں چھکڑے کے پیچھے بھگا دیا۔

اچھتا کودتا اور جھومتا ہوا چھکڑا قصر کی خندق کے چوٹی پل کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اور دونوں متعاقب کرنے والوں سے کئی گز آگے تھا چھکڑے کی رفتار کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے پچھلے پہننے سڑک سے تقریباً ایک انچ اوپر تھے وہ اسے چھونہ رہے تھے۔ بے تحاشہ بھاگتے ہوئے گھوڑے خندق کے پل پر سے گزر رہے تھے کہ چھکڑے کا ایک پچھلا پیسہ آڑھ میں پھنس گیا جس کا دوسرا برا قصر کی دیوار میں مضبوطی سے لگا ہوا تھا۔ چھکڑا کے نتھوں کی چرچر اہٹ، اس کے آہنی سازو سامان کی جھنکار اور پہننے کے ٹوٹنے کا چناخہ سنائی دیا۔ چھکڑے کے یوں اچانک تھم جانے کہ وجہ سے گھوڑوں کو ایسا شدید جھکا لگا کہ ایک گھوڑا درد اور تکلیف سے چیخ اٹھا۔ اور دوسرا اپنی اگلی ٹانگوں پر بیٹھ گیا۔

پہننے کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے چھکڑا آہستہ آہستہ ایک طرف جھکنے لگا۔ اس میں رکھے ہوئے دو تابوتوں میں سے ایک پھسل کر چھکڑے کے کنارے تک آگیا۔ اور وہاں ٹھہر گیا۔ لیکن چھکڑا اور جھکا اور تابوت چھکڑے کے کنارے پر سے پھسل کر چوٹی پل کے کنارے پر آ پڑا۔

چارلس اور فادر شینڈور نے گھوڑوں کی لگائیں کھینچ لیں اور انہوں نے دیکھا کہ

چارلس چھکڑے پر سے لنگ کر پل اور وہاں سے چھوٹی سی عمودی ڈھلان پر سے کچھ بھاگتا اور کچھ بھستتا ہوا خندق میں آگیا۔ خندق قصر کی دیوار اور کنارے کے درمیان ایک اندھیرے اور زبردست فشار کی طرح تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے چارلس نے برف کا معائنہ کیا اور اپنی ایک ٹانگ پر بدن کا پورا بوجھ ڈال کر اسے آزمایا۔ برف کافی مضبوط معلوم ہوتی تھی اور اگر وہ تابوت کا بوجھ سہار گئی تھی تو یقیناً چارلس کا بوجھ سہار سکتی تھی۔

چارلس تابوت کی طرف چلا۔

سورج کی آخری سرخ کرن قصر ڈراکیولا کے بلند ترین برج کا ماتھا چوم کر رخصت ہوئی۔ خندق میں گہرا اندھیرا ہو گیا۔ تابوت کے ڈھکن کے جوڑ چارلس کو نظر نہ آرہے تھے۔ البتہ اتنا تو بہر حال معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا ڈھکن مضبوطی سے بند تھا اور اس تابوت کے ڈھکن سے جس میں ڈانٹا تھی۔ مختلف ساخت کا تھا چنانچہ اسے کھولنا آسان نہ تھا۔ وہ ڈھکن کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

”وقت گزر گیا۔“ پل پر سے آواز سنائی دی۔

چارلس نے اپنی کوششیں ترک کر کے اور سر اٹھا کر پل کی طرف دیکھا۔ وہاں فادر شینڈور اور اس کا سہارا لئے ڈانٹا کھڑی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔

”چارلس! وقت گزر گیا۔ وہاں سے فوراً ہٹ آؤ۔“ فادر شینڈور نے پھر کہا۔

چارلس شش بچ کے عالم میں کھڑا رہا۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ کیا کرے وہ ذرا سا تابوت کی طرف گھوم گیا اور عین اسی وقت تابوت میں لیٹے ہوئے ڈراکیولا نے ڈھکن اٹھا کر دور پھینکا اور ایک استخوانی ہاتھ نے تابوت میں سے نکل کر چارلس کی کلائی پکڑ لی۔ اسکی سرد اور پتلی انگلیوں کی گرفت آہنی تھی۔

چارلس نے اپنے قدم جمائے کو کوشش کی کہ اس عفریت کا مقابلہ کر سکے جو

تابوت میں ڈانٹا لیٹی ہوئی تھی اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ کھلی کیا تھیں پھٹی ہوئی تھیں، اور چارلس کانپ گیا۔ اس نے سوچا کہ ڈانٹا اسے نہ دیکھ رہی تھی، اسے پہچان نہ رہی تھی۔ شاید وہ ڈانٹا بن چکی تھی۔ ڈراکیولا اس کا خون چوس چکا تھا۔ اور اسے اپنی دلن بنا چکا تھا۔ لیکن نہیں۔۔۔ چارلس کا یہ خدشہ بے بنیاد تھا کیوں کہ فوراً ہی ڈانٹا کے رخسار پر ایک آنسو لڑھک آیا۔ اور اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

چارلس نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے کے اسے تابوت میں سے باہر نکال لے لیکن فادر شینڈور نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”آپ ان کی طرف سے بے فکر رہیے۔ میں تو نہیں ہوں البتہ آپ۔۔۔ اس کا فیصلہ کر دیجئے۔“

اور چارلس نے نیچے خندق میں نظر کی۔ جی ہوئی ٹھوس برف پر سے دھوپ کی روشنی ختم ہو رہی تھی۔ اور ڈراکیولا کا تابوت اس کے انتہائی سرے پر اور قصر کی دیوار کے قریب پڑا ہوا تھا۔

”آپ کو جلدی کرنی چاہئے“ فادر شینڈور نے کہا ”دن کی روشنی ختم ہو رہی ہے۔“

تابوت میں سے نکل رہا تھا۔ اس کے پیرجمنے کے بجائے برف پر سے پھسل رہے تھے۔

”گولی مار دیجئے اسے“ ڈاکٹر چیخ رہی تھی ”آپ اسے گولی کیوں نہیں مارتے؟“
 ”بے فائدہ ہے بیٹی“ فادر شینڈور کی آواز میں تاسف تھا۔ گولی اس پر اثر نہ
 کرے گی۔“

چارلس نے ڈائنا کو فادر شینڈور کے ہاتھ سے بندوق کھیلتے دیکھا اس عرصے میں ڈرائیولا فتح مندانہ غراہٹ کے ساتھ تابوت میں سے نکل آیا تھا۔ چارلس اور ڈرائیولا ہاتھ پائی کرتے قصر کی دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ چارلس نے ڈرائیولا کے جڑے پر ایک زور دار گھونسا رسید کر دیا۔ لیکن ہاتھ اس نے اس زور سے چلایا تھا کہ خود ہی توازن کھو بیٹھا۔ اس نے سنبھلنے کے لئے دونوں ہاتھ چلائے تو ڈرائیولا نے اس کا حلق دبوچ لیا۔ اور اسے قصر کی طرف دھکیلتے لگا۔

عین اسی وقت بندوق کے دھماکے کی آواز قصر کی بے حس دیواروں سے ٹکرائی۔ گولی ڈرائیولا کے تونہ لگی البتہ ان سے صرف چند قدم دور برف سے ٹکرائی۔ برف کی ایک لمبی سنے قاش اگھرنی اور وہاں سے پانی کا چھوٹا سا فوارہ بل پڑا اور چارلس نے ڈرائیولا کو گھبرا کر ایک طرف ہٹتے محسوس کیا۔

پانی کچھ دور تک سطح یرف پر بننے کے بعد پھر اسی میں سما گیا۔

”ہاں۔“ فادر شینڈور چلایا ”مہستاپانی.....“

مسلسل دو دھماکے سنائی دیئے۔ ڈرائیولا غرایبا اور اس نے چارلس کو قصر کی دیوار تک ڈھکیل دیا۔ عین اسی وقت بندوق کی تیسری گولی ان کے بہت قریب برف میں آکر لگی اور اسی دفعہ برف کی سطح پر ایک ٹیڑھی میڑھی اور خطرناک دراڑ پیدا ہو گئی۔

غصے کی ایک پھنکار کے ساتھ ڈرائیو لے چارلس کو چھوڑ دیا۔ وہ آزاد تھا اور اب

وہ کچھ دوڑتا اور کچھ پھسلتا ہوا خندق کے کنارے کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ برف اس کے پیروں تلے دب گئی اور سرد پانی اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔ چارلس لڑکھڑایا۔ منہ کے بل گرا اور سینے اور پیٹ کے بل برف پر اپنے آپ پھسلتا ہوا کنارے تک پہنچ گیا۔

جب وہ ساحل پر چڑھ رہا تھا تو اس نے بندوق کے کئے ایک مسلسل دھماکے سنے۔ فادر شینڈور نے بندوق میں نئے کار تو س بھرے اور متواتر لیلی دبانے لگا۔ برف پر گولی کے لگنے اور پھر اس کے فوراً بعد ہی برف کے پھٹنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ سطح برف پر کئی دراڑیں پیدا ہو گئیں اور پھر مسلسل گولیوں کی تاب نہ لا کر وہ سب کی سب آپس میں بھگلیں ہو گئیں۔ اور بخ بستہ سطح سے پانی کے سوتے پھوٹ نکلے اور پانی برف کی سطح پر بننے لگا۔

ڈراکیو لادیاوار میں گھنے گی کو شش کر رہا تھا۔ وہ بپنے تک پنچنے کی کو شش کر رہا تھا کہ اس پر چڑھ کر اپنے آپ کو فٹا ہونے سے بچالے۔

چارلس دوڑ کر ڈانکا کے قریب پہنچ گیا۔ ڈرائیولا سے ہاتھ پائی اور پھر کنارے تک پہنچنے کی کوششوں نے اسے تھکا مارا تھا چنانچہ جب وہ اپنی بیوی کے قریب پہنچا تو بری طرح ہانپ رہا تھا لیکن خدق میں ادھر ادھر کھسکتے اور راہ فرار تلاش کرتے ہوئے ڈرائیولا کی کوششیں بڑی جاذب توجہ تھیں۔ بلکہ پٹناٹرم کا اثر رکھتی تھیں چنانچہ وہ اس کے طرف دیکھنے لگا۔

قادر شینڈور نے شت باندھ کر ایک بار لیلیٰ پھر دبا دی۔

یوں معلوم ہوا جیسے کسی نے برف کا ایک سرا پکڑ کر اس سے ایک بڑا سا ٹکڑا نوج لیا ہو۔ برف کٹ گئی۔ وہ حصہ جس پر ڈرائیولا کھڑا ہوا تھا۔ الگ ہو گیا۔ اور پھر وہ ایک طرف نیچے کی طرف جھکنے لگا۔

تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکراتے لگے۔

ختم شد



آئیڈیل
گلی مشن
پروگرام

آئیڈیل
گلی مشن
پروگرام

ڈرائیولا غصے اور انتقام کی آگ سے بے تاب ہو کر دونوں کے بزدل میں جلا
غیث روح کی طرح بھیانک آواز میں چیخا، سامنے کھڑے ہوئے اپنے کامیاب دشمنوں
کی طرف دونوں ہاتھ چلائے، گرا اور بغل تک ڈوب گیا۔ ایک لمحے تک وہ برف کا
کنارا پکڑے رہا لیکن اس کی انگلیاں اندر کی طرف مڑ رہی تھیں اور اٹھ رہی تھیں یا
شاید وہ مٹی بن رہی تھیں۔ بہر حال یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ عین اسی وقت
برف کا وہ سرا جیسے ڈرائیولا نے پکڑ رکھا تھا۔ ٹوٹ گیا اور برف کی تہ کے نیچے بہتے
ہوئے پانی نے اس عفریت کو آہستہ آہستہ نکل لیا۔

غرق ہوتے وقت اس کا بھیانک لمبو ترا چہرہ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اور اس کا منہ کھلا ہوا
تھا۔ عفریتوں کا وہ آقا شاید اپنی مدد کے لئے ان غیث روحوں کو پکار رہا تھا جو وہاں نہ
تھیں۔ اور پھر پانی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ سرخ دھاریوں والا سیاہ لبادہ
ایک سیکنڈ تک سطح آب پر مردہ چمکاؤں کے بازوؤں کی طرح پھیلا رہا اور پھر وہ بھی غرق
ہو گیا۔

چارلس نے ڈانٹا کو سینے سے لگا کر اس کے ہونٹ چوم لئے لیکن فادر شینڈور
بندوق کا گھوڑا چڑھائے اب بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا جہاں ڈرائیولا غرق ہوا تھا۔
اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ فنا ہو چکا ہے۔ اسے خوف تھا کہ کہیں وہ پھر زندہ ہو کر نہ نکل
آئے۔

لیکن پانی کی سطح پر برف کے ٹکڑوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

اندھیرا گاڑھا ہو رہا تھا۔ قصر ڈرائیولا خاموش اور مبہوت کھڑا تھا اور اس قصر کا
مالک، کونٹ ڈرائیولا فنا ہو چکا تھا۔

اب وہ کبھی واپس نہ آئے گا۔

فادر شینڈور نے چارلس کی طرف دیکھا جسکے ہونٹ ڈانٹا کے لبوں سے چپاں

پاکستانی عمارتیں

